بدرشہزادی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

بدر شہزادی

اشرف صبوحی

مکتبہ پیامِ تعلیم ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

Badar Shahzadi
by
Ashraf Suboohi
Rs. 15/-

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
Email:monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003

مئی 2012ء   تعداد:1000   قیمت:-/15 روپے

کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

فہرست

بدر شہزادی	۵
نانی بستی	۱۱
مغرور شہزادی	۲۶
ہیرامن توتا	۴۰
مغرور تیندوا	۵۴

بدر شہزادی

بدر شہزادی کو سموسے بہت ہی زیادہ بھاتے تھے لیکن ایسی چیزیں اس کو ہفتے میں صرف دو مرتبہ ملتی تھیں تاکہ پیٹ خراب نہ ہو۔ ایک روز وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو اپنی شادی سموسے والے سے کروں گی تاکہ روزانہ صبح و شام چائے کے ساتھ سموسے کھانے میں آئیں۔ اب تو فقط منگل اور جمعہ کو ملتے ہیں۔

بچّہ تو تھی ہی یہ بات کہیں نوکروں کے سامنے بھی منہ سے نکل گئی اور نوکروں نے کسی موقع پر بادشاہ سلامت سے بھی کہہ دیا۔ بادشاہ کو بڑا خیال ہوا۔ انھوں نے سارے سموسے والوں کو اپنے شہر سے نکال باہر کیا۔ کیونکہ گو شہزادی ابھی جوان نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کا اٹھان ایسا تھا کہ ہر چھٹے مہینے اس کے سارے کپڑے چھوٹے ہو جاتے تھے۔ یہ خوف ہوا کہ کہیں شہزادی جوان ہو گئی اور اسی خیال میں رہی تو بڑا ہو گا۔

ادھر شہزادی نے جب سُنا کہ سارے سموسے والے شہر سے نکال دیے گئے تو اسے بہت رنج ہوا اور وہ خوب روئی۔ بچّہ تھی۔ رو دھو کر بیٹھ رہی لیکن اس کا جسم بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جتنے کپڑے بنتے دوسرے ہی مہینے تنگ اور چھوٹے ہو جاتے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے اس کے لیے ایک قیمتی پوشاک بنوائی۔ وہ جب تیار ہو کر آئی خاصی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ تین مہینے نہیں گزرے تھے کہ وہ بھی تنگ ہو گئی۔

بادشاہ نے جب یہ کیفیت سُنی تو کہا اس صورت میں معلوم ہوتا ہے شہزادی جوان ہو گئی ہے اور اب اس کی شادی کا انتظام کرنا چاہیے۔ چنانچہ پرانے دستور کے مطابق سرکاری تصویر بنانے والے کو حکم دیا کہ شہزادی کی تصویریں بنائے تاکہ نزدیک اور دُور کی حکومتوں میں بھیجی جائیں۔ شہزادی نے اگرچہ کہہ دیا تھا کہ تصویر ایسی بنانا کہ جو دیکھے ڈر جائے۔ اور مصوّر نے بنائی بھی ایسی تھی تاہم چھے شہزادے اس کی تصویر دیکھ کر شادی کرنے پر تیار ہو گئے اور زرق برق پوشاکیں پہن گھوڑوں پر سوار ہوئے تحاشا دوڑتے ہوئے بدر شہزادی... کے شہر میں شادی کرنے کے لیے آپہنچے۔

بادشاہ نے ان سب کی آؤ بھگت کی اور بدر شہزادی کو بلایا تاکہ وہ ان میں سے اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرے۔ لیکن شہزادی نے کہا میں تو سموسے والے سے شادی کروں گی۔

ان آنے والے شہزادوں میں سے پانچ نے باری باری نہایت شان کے ساتھ اپنا گھٹنا ٹیک کر کھڑے ہوتے ہوئے شہزادی سے

درخواست کی کہ اپنا فیصلہ بدل ڈالے لیکن شہزادی نے ہر بار اپنا سرہلا کر یہی کہا کہ میں تو ایک سموسے والے سے شادی کروں گی۔

پانچوں شہزادے اپنی اپنی کہہ چکے تو چھٹے شہزادے کا نمبر آیا۔ وہ ان سب میں طاقتور اور خوبصورت تھا۔ اس نے بجائے ایک گھٹنا ٹیکنے۔ شہزادی کی خوشامد کرنے اور یہ کہنے کے کہ آپ اپنا خیال بدل ڈالیں اور مجھ سے شادی کریں سیدھا آگے بڑھا جھک کر سلام کیا اور بولا۔ "آپ حلوا سوہن بنا سکتی ہیں؟"

شہزادی اس سوال سے ایسی گھبرائی کہ پسینا آگیا۔ اور جواب میں یہی کہتے بنا کہ میں نہیں جانتی۔ اس لیے کہ میں نے کبھی نہیں بنایا۔

شہزادہ (دوبارہ سلام کرکے) مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے شادی نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اس سے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔ جو حلوا سوہن نہیں بنا سکتی۔ لہذا شاہزادی صاحبہ خدا حافظ!

اس سے پہلے کہ شہزادی کچھ جواب دیتی شہزادہ سلام کرکے باہر نکل گیا۔ اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو یہ جا وہ جا۔ اس کے بعد دوسرے پانچوں شہزادے بھی مایوسی کے عالم میں اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ منہ لٹکائے روانہ ہو گئے۔

بادشاہ نے اپنا تاج اُتارا اس پر پھونک ماری اور پھر اسے ذرا ترچھا سر پر رکھ کر ارشاد فرمایا۔ عجیب معاملہ ہے۔ چھے خاصے خوبصورت شہزادے ایک ہی وقت ایک ٹھوکر سے ٹھکرا دیے گئے۔

شہزادی۔ چھ نہیں پانچ۔ آپ شاید بھول گئے کہ ان میں سے ایک نے تو مجھے ٹھکرایا ہے۔ یہ اس کی انتہائی ناشائستگی تھی اور میں اس سے شادی کرنے کا خیال تک نہ کروں گی خواہ اب وہ دن میں دس بار آکر میری کیسی ہی خوشامد کیوں نہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی حیران ہوں کہ حلوا سوہن بنتا کس چیز کا ہے؟

بادشاہ۔ مجھے بالکل نہیں معلوم۔ باورچی خانے کے داروغہ سے پوچھو۔

باورچی خانے کا داروغہ بلایا گیا۔

شہزادی۔ داروغہ حلوا سوہن کس چیز کا بنتا ہے؟

داروغہ۔ شہزادی صاحبہ! حلوا سوہن سمنک روے دودھ ملائی گھی، اور شکر وغیرہ کا بنتا ہے اور ان سب چیزوں کو چاندی کے کڑھاو میں پکاتے ہیں۔

شہزادی۔ یہ تو بہت آسان ہے۔ اچھا تو ایک بوری سمنک دس بوری روا پانچ کپے گھی۔ دو من ملائی اور بیس من دودھ حاضر کرو۔ اور ہاں کم از کم دو درجن چاندی کے کڑھاو بھی نئے بنوا لاؤ۔ میں حلوا سوہن بنانا سیکھوں گی۔

لیکن جس وقت شہزادی حلوا سوہن بنانے بیٹھی تو اسے معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ کسی مٹھائی کا بنانا مشکل نہیں۔ سیروں سمنک خاک میں ملا دی۔ منوں روا برباد کر دیا۔ دودھ کی بالٹیاں کی بالٹیاں موریوں میں بہ گئیں کڑھاوں کے پیندے نکل گئے۔ اپنا منہ اور انگلیاں جلا لیں۔ بادشاہ سلامت بھی روزانہ شکایتیں سنتے سنتے تنگ آ گئے۔

کڑھائیاں بنانے والوں کے بل کی رقم ہزاروں تک پہنچ گئی۔ مودی خانے والے الگ پریشان باورچی جُدا مصیبت میں۔ پھر مرہم پٹی کے لیے صبح شام جرّاح الگ آتے شاہی عملے کا واقعی ناک میں دم تھا۔ لیکن شہر اور آس پاس کے دیہاتی بچّے بے حد خوش تھے۔ وہ روز صبح کو محل میں آتے اور شہزادی انھیں بگڑا اور جلا ہوا حلوا سوہن بانٹا کرتی۔

باپ کی ناراضگی اور عملے کی شکایتوں کے باوجود شہزادی اپنی دُھن میں لگی رہی۔ کسی کی پروا نہیں کی۔ آخر کامیاب ہو گئی اور نہایت بہترین مزیدار حلوا سوہن بنانے لگی۔

ایک دن وہ اپنے محل میں بیٹھی تھی کہ سموسے بیچنے والے کی آواز سُنی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں ہوا کہ یہ سموسے والا ہے۔ اس کے کان نہیں بجے تھے۔ کھڑکی کا دروازہ کھول کر باہر نظر ڈالی اور دیکھا ایک شخص سفید بُراق سے کپڑے پہنے رکابداروں کی وضع بنائے اور ایک کشتی سر پر رکھے بازار کی طرف چلا آرہا ہے۔ کشتی پر سبز رنگ کا خوان پوش اس طرح پڑا ہے کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ دس دس پانچ پانچ قدم پر وہ گھنٹی بجاتا اور آواز لگاتا ہے۔

آتے آتے جب وہ جھروکے کے نیچے پہنچا اور شہزادی کو سر نکالے جُھکے دیکھا تو ٹھٹک کر کہنے لگا۔ "حضور! سموسے تو نہیں چاہییں؟"

شہزادی دتالیاں بجاکر) ہاں ہاں! لیکن میں نے آج کا اپنا سارا جیب خرچ ختم کر دیا ہے۔ میں اُن کی قیمت نہیں دے سکتی۔

سموسے والا۔ اس کی پروا نہ کیجیے۔

شہزادی۔ اچھا ادلے کا بدلہ کر لو۔ کیا تم کو حلوا سوہن پسند ہے۔ سموسوں کی قیمت میں حلوا سوہن لے لوگے؟ بالکل تازہ اور میرے اپنے ہاتھ کا بنا ہوا۔ سموسے والا بڑی خوشی سے "حلوا سوہن پر تو میری جان جاتی ہے"۔

شہزادی۔ تو پھر لو۔ پکڑو۔

اس نے حلوا سوہن کی ایک ٹکیا نیچے سموسے والے کی طرف پھینکی۔ لیکن ٹکیا کے پکڑنے میں کشتی پھسلنے لگی۔ اور جب تک سموسے والا خود سنبھل کر اسے سنبھالے بہت سے سموسے سڑک پر بکھر گئے۔

شہزادی نے پہلے تو ایک مایوسی کی چیخ ماری اور اس کے فوراً ہی بعد حیرت سے چلائی۔ "ارے ہائیں!" کیا سمجھے؟ یہ سموسے والے حضرت نہ کوئی باورچی تھے نہ رکابدار، چھٹے شہزادے بہادر تھے۔

پھر جب وہ شہزادہ شہزادی اور بادشاہ سلامت تینوں ناشتہ کرنے بیٹھے اور خوانچے کے بچے بچائے سموسے کھانے لگے تو شہزادے نے کہا نہ صرف سموسے میری پسند کی چیز ہیں بلکہ اس سلسلے میں ان کا بنانا بھی میں نے سیکھ لیا ہے۔

شہزادی (شرماتے ہوئے) اور میں حلوا سوہن بنانا سیکھ گئی ہوں۔

بادشاہ (دوسرا سموسہ اٹھا کر) اس حالت میں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو۔ میں بھی تمھاری خوشی میں شریک ہوں۔

دونوں کی شادی ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔

نانی بستی

خدا بخشے نانی بستی کو، ایسی جنّت کی حوروں کو مات کرنے والی بیویاں اب کہاں۔ کیا نورانی شکل تھی۔ اور کیسی بھولی بھالی باتیں سٹربلّی سٹرنجی بستری نہیں کہ اوٹ پٹانگ بولیں یا چوہے کو بلّی اور بلّی کو چوہا بنائیں۔ گھر والوں پاس پڑوسیوں کی ہنسی کا کھلونا ہوں۔ سگھڑاپا ان کا ساکسی میں ہوتو لے۔ کھانے پکانے میں ایسا سلیقہ کہ باورچی اور رکابدار مات۔ گھر کی جو چیز ہے اپنے ٹھکانے پر۔ انگنائی دیکھو تو چندن سی۔ دالانوں میں ہر وقت اُجلا فرش۔ لوگ کہتے ہیں کہ روپ کی روئے اور کرم کی سیجوں پر سوئے۔ یہاں خدا نے روپ بھی دیا تھا۔ اور کرم بھی۔ بات یہ ہے کہ عورت کی تقدیر سلیقے میں ہوتی ہے۔ آج تک جوانی سے بڑھاپا آگیا تھا۔ میاں بیوی کی کھٹ پٹ کسی نے نہ سُنی۔

خاں صاحب جیسا جلاتن آدمی سدا بیوی کا دم بھرتا رہا۔ یہ بھی نہیں کہ نگوڑی نا کھٹی تھی۔ ماشاء اللہ چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ سب ایک سے

لے بدتمیز۔ ٹے بدحواس ٹے اعلا کھانے پکانے والا۔ ٹے قسمت والی ھے بے اولاد۔

ایک تمیز دار۔ دیکھنے والے ان کے قاعدے قرینے دیکھ کر حیران ہوتے کہ اِدھر خاں صاحب مزاج کے ایسے کڑوے، اُدھر نانی لبتی، دنیا کی باتوں سے بے خبر۔ اور بچّے ایسے، جیسے جنتری میں سے تار کھینچے چلے جاتے ہیں۔ مجال کیا کہ کوئی بے طور اٹھا ہو۔ ہاں آج کل جیسی تین پانچ[1] کسی میں نہ تھی۔

خاں صاحب بھلے اور مزاج کے کھرے ضرور تھے، مگر پکّے مسلمان۔ نیت کے صاف۔ دل میں سب کا درد رکھنے والے۔ محلّے بھر کے خدمتی بیواؤں یتیموں کے خبر گیر۔ جمعہ کے جمعہ عزیزوں، رشتہ داروں کے ہاں جاتے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں جھک پڑتے۔ شہر کے ایک رئیس کے ہاں مختار عام تھے۔ تنخواہ تو پچاس چالیس سے زیادہ نہ تھی۔ وہ وقت ہی ایسا تھا، ہر چیز سستی۔ اس زمانے کے سے تکلّفات نہ تھے۔ بڑے آرام چین سے گزر ہوتی۔ لیکن افسوس ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔ صرف ایک لڑکی کا بیاہ کرنے پائے تھے کہ یکایک موت آگئی۔ دوسری لڑکیوں کے بیاہ اور بیٹے کے سہرے کی بہار دیکھنے کا ارمان دل کا دل ہی میں لے گئے۔

لوگ سمجھتے تھے کہ خاں صاحب کے بعد نانی لبتی اس بھولے پن کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ لڑکیوں کو کہاں بر ملیں گے۔ لیکن یہ خبر ہی نہیں کہ دنیا میں اگر عقل مند اور ہوشیار ہی نصیب والے ہوتے، تو بے چارے سیدھے سادے بے وقوف کیوں کر زندہ

---

[1] دھوکا۔

رہتے۔ انھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ خدا کی کریمی کے قربان، رئیس نے خاں صاحب کی تنخواہ نانی بستی کے نام کر دی۔ لڑکیوں کے گھر بیٹھے رقعے آنے لگے۔ دو برس کے اندر اندر سب کی تقدیریں کھل گئیں اور بیٹیاں ہی اپنے اپنے گھر کی نہیں ہوئیں بیٹے کی چاندسی دلھن آ گئی۔

نانی بستی کی سگی چھوٹی بہن میرٹھ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ خاں صاحب کی زندگی میں ایک مرتبہ ان کا میرٹھ جانا ہوا تھا تو اونٹ گاڑی یا گھوڑوں کی شکرم[1] میں۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے انھوں نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا انجمؔ کو دیکھے برسوں ہو گئے ہیں۔ شادیوں میں بلایا تو نہ گئی۔ کیا جانے کیسی ہے۔ جی چاہتا ہے اسے دیکھ آؤں۔ تمھارے ابّا خدا بخشے اب زندہ نہیں کہ اچھی طرح پردے کا انتظام کر کے لے جائیں۔ تم شکرم میں بٹھا کر پہنچا دو۔ اونٹ گاڑی موئی تو مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ بیٹا بولا جب آپ حکم دیں۔ اور شکرم یا اونٹ گاڑی میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کو دھوئیں کی گاڑی میں لے چلوں گا۔ ریل ان دنوں شروع جاری ہوئی تھی۔ اور عام طور پر اسے دھوئیں کی گاڑی کہتے تھے۔

نانی بستی نے حیران ہو کر پوچھا "اوئی بھئی یہ دھوئیں کی گاڑی کیسی؟ کیا اس کے اندر چولھے سلگتے ہیں؟ نہیں میاں میری تو آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ پہلے ہی مجھے کم سوجھنے لگا ہے۔ اندھا کرنا ہو تو ویسے کہہ دو۔" بیٹے نے ریل کی حالت سمجھا بجھا کر بتائی اور کہا

---

[1] ایک طرح کی قدیم گاڑی۔

کہ اس کے آنے جانے کے وقت مقرر ہیں۔ میں آج اسٹیشن پر جاکر اس کے چلنے کا وقت پوچھ آؤں تو کل میرٹھ چلے چلیں گے۔"

نانی بستی: یہ اسٹیشن کیا بلا ہے؟ کیا ریل کا اڈا نہیں ہوتا۔

بیٹا: اماں جان ریل کے اڈے کو اسٹیشن کہتے ہیں۔ جب چلو گی تو دیکھ لینا۔ بہت بڑا مکان بنا ہوا ہے۔ وہاں ریل گاڑی کھڑی رہتی ہے۔

نانی بستی: مجھے آگے کی طرف نہ بٹھانا۔ ایک دفعہ اونٹ گاڑی میں تمہارے بادا نے آگے بٹھا دیا تھا۔ کمبخت نے سڑا دیا۔

بیٹا: ارے بی ریل میں اونٹ تھوڑی جتتے ہیں۔

نانی بستی: وہاں تو گھوڑے لگتے ہوں گے۔ وہ نگوڑے اونٹ سے بدتر۔ ان کی دُلتیوں کے دھماکے سے خدا بچائے۔

بیٹا: گھوڑے بھی ریل کو نہیں کھینچتے۔

نانی بستی: اوئی میاں تو کیا اڑن کھٹولا ہے۔

بیٹا: اس کے چلنے کی ترکیب تو میں بھی نہیں جانتا۔ ہاں وہ دھوئیں پانی سے چلتی ہے۔ اور ایسے فرّاٹے بھرتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔

نانی بستی: خیر بھئی تمہیں اختیار ہے جس میں چاہے بٹھا کر لے چلو۔ اب تم سے کیا کہوں۔ مگر اتنا خیال رکھنا کہ بڑھاپے میں مٹی خراب نہ ہو۔

دوسرے دن صبح ہی صبح صاحبزادے اسٹیشن پر گئے اور دوڑے دوڑے آکر بولے۔ اماں جان میں گاڑی کا وقت پوچھ آیا ہوں۔ ٹھیک بارہ بجے جاتی ہے۔

تیار ہو جاؤ۔ میں نے ڈولی کو کہہ دیا ہے۔

نانی بستی جلدی جلدی اپنی گٹھری مٹھری سنبھالنے لگیں۔ بستر باندھا پان دان سجایا۔ لوٹا کٹورا لیا۔ اتنے میں کہاروں نے آواز دی کہ ڈولی آگئی ہے۔ گھر والوں سے خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملیں۔ روتے ہوئے سب کو رخصت کیا۔ اللہ بیلی! اللہ نگہبان کہتی ہوئی ڈولی میں بیٹھیں۔ بیٹے نے گلی کے باہر سے اکا کرایہ پر لیا۔ سارا سامان اس میں رکھ کر ڈولی کے ساتھ ساتھ چلنے کی تاکید کی۔ اور بسم اللہ کر کے اسٹیشن پر چلے۔

جو پرانی وضع کے لوگ ہیں آج بھی اسٹیشن پر گھنٹوں پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ پہنچتے پہنچتے گاڑی چھوٹ گئی۔ بچاروں کو اتنی مدت میں بھی ریل کے اوقات کی پابندی کا خیال نہیں آتا۔ اسٹیشن پر جا کر یہ تماشے دیکھ لیجیے۔ دس بجے گاڑی جاتی ہے۔ صبح سے اسباب سنبھالے بیٹھے ہیں۔ یا گاڑی چل پڑی اور یہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ تو سمجھ لیجیے اس زمانے میں اونٹ گاڑیوں میں سفر کرنے والوں کی کیا کیفیت ہوگی۔

نانی بستی کی ڈولی اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ گاڑی کے روانہ ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی ابھی کھلی نہیں تھی۔ نانی بستی کے بیٹے بھی آخر نانی بستی کے بیٹے تھے۔ مرد ہونا اور بات ہے۔ تھے تو پرانے زمانے کے آدمی۔ ریل میں سفر کرنے کا دو ایک ہی دفعہ اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ۔ اب وہ ٹکٹ کے لیے بولائے[1] بولائے پھر رہے ہیں۔ کبھی ادھر جا کبھی

---

[1] گھبرائے گھبرائے

اُدھر۔ اِس سے پوچھ اُس سے پوچھ۔ ٹھیک جواب کون دے۔ جتنے مسافر تھے اِن ہی جیسے۔ آخری گھنٹی بجی۔ بابُو نے آواز دی ٹکٹ لینے والو چلو۔ مسافر دوڑے۔ تُو مجھ پر اور میں تجھ پر۔ کھڑکی پر دھکا پیلی ہونے لگی۔ نانی لبتی ڈولی میں بیٹھی بیٹھی مسافروں کی ہُنت مُنت دیکھ دیکھ کر جل تو جلال تو کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ آخر بڑی کش مکش کے بعد مشکل حل ہوئی۔ ٹکٹ لے کر آئے۔ مزدور کے سر پر اسباب رکھوایا۔ کہاروں سے کہا۔ لو بھئی اندر چلو۔"

ریل کا نیا نیا انتظام تھا۔ باقاعدہ قلی تھے ' نہ اتنے بالو۔ زنانی مردانی گاڑیوں کی پوری پہچان نہ تھی۔ جہاں ریل کھڑی تھی کہاروں نے ڈولی تو رکھ دی مگر نانی لبتی کو بٹھائیں کہاں۔ سب گاڑیوں میں مرد گھسے جاتے ہیں۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر گارڈ نے پوچھا "ویل کیا مانگتا ہے؟" یہ بولے پردے والی سواری ہے کس جگہ بٹھاؤں۔ گارڈ تو ایک خالی گاڑی بتا روانہ ہوا۔ انھوں نے ڈولی گاڑی کے برابر لگوا کر کہا "اماں جان! ایجیے اُس گاڑی کے اندر بیٹھیے۔ میں سامان رکھواتا ہوں۔"

مزدور اس ہاہڑ تابڑ[1] میں پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر مسافروں کی ریل پیل۔ وہ الگ میاں کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اور میاں جدا "ابے او مزدور! ابے او مزدور!" کی آوازیں لگاتے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو ڈولی والوں کا خدا بھلا کرے۔ انھوں نے نانی لبتی کا سامان

---

[1] ہنگامہ

پہچان لیا۔ اور میاں کو بتا دیا۔ اب جو یہ دیکھتے ہیں تو جس گاڑی میں اماں کو بٹھایا تھا وہ نہیں ملتی۔ ساری گاڑیاں یکساں۔ آوازیں دیتے دیتے تھک گئے۔ نانی بستی کی سُنیے۔ گاڑی میں جو گھُسیں تو آدم نہ آدم زاد۔ کھڑکیاں بند ہکّا بکّا کھڑی ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ ہو تو بیٹھیں۔ یا اللہ یہ گاڑی ہے کہ جانوروں کا پنجرا۔ اِدھر سلاخیں اُدھر سلاخیں کہاں بیٹھوں؟ بنچ پر بیٹھتی ہوں تو بے پردگی کا ڈر۔ دروازے ہیں سے کسی مردوے نے جھانکا تو کیا ہوگا۔ اوپر مچان پر چڑھیں کس طرح؟ جوان ہوتیں تو اُچک کر جا بیٹھتیں۔ بنچ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ دل میں کہا، "اچھا پردے والیوں کے بیٹھنے کی یہ جگہ ہے۔ اے ہے اس سے تو ہمارے ہاں کی اُپلوں کی کوٹھی لاکھ درجے اچھی۔ کیونکر بیٹھوں؟" لیکن کرتی بھی کیا۔ پردے کا خیال۔ بہن سے ملنے جانا ضروری۔ دوسرے اب تو آپھنسی تھیں، جوں توں کرکے بنچ کے نیچے بُرقعہ بچھا کر گنڈلی مُنڈلی مار پڑ گئیں۔ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی۔ "بیٹھو بیٹھو دروازے بند کرو" کی آوازیں پڑنے لگیں۔ مزدور نے کہا: "میاں کیا دیکھتے ہو جلدی سوار ہو۔ گاڑی چھوٹنے والی ہے۔" سامنے والی گاڑی بالکل خالی تھی۔ مزدور نے دروازہ کھولا سامان رکھا اور میاں اندر گھسے۔ ریل چل پڑی۔ مگر میاں پریشان کہ اماں کو کہاں ڈھونڈوں۔ میرٹھ تک اُن کا نہ جانے کیا درجہ ہو جائے۔ پاندان بھی تو ان کے پاس نہیں۔ لوٹا کٹورا بھی رہ گیا۔ جس گاڑی میں یہ بیٹھے، انھیں کیا خبر کہ اماں جان ہی والی گاڑی ہے۔ اور بنچ پر جہاں آپ

تشریف فرما تھے، ٹھیک وہیں نیچے وہ دم سادھے پڑی تھیں۔
جمنا کے پل پر پہنچ کر ریل کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور نانی بستی نے گھبرا کر بے دھیانی میں اٹھنا چاہا۔ سر میں بنچ کی کھٹاک سے ٹھیک[1] لگی۔ ہائے ہائے کی آواز سن کر صاحبزادے چونکے۔ جھک کر کیا دیکھتے ہیں کہ اماں جان پسینے میں شرابور سکڑی ہوئی پڑی کراہ رہی ہیں۔

بیٹا: ہائیں اماں جان!
نانی بستی: کیوں اب بھی نہ آتے ہوتے! شاباش بیٹا شاباش! ماں بندی کا خوب لکھا پورا کیا۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دُہائی۔ میں نے قسم کھالی ہے جو کبھی تیرے ساتھ کہیں جاؤں نہ ہوئے آج کو خاں صاحب۔ ان موئے بھلے مانسوں کی آبرو کے دشمن ریل والوں کو کھا کھا جاتے۔
بیٹا: ارے بی تم یہاں کیوں لیٹی ہو۔ باہر نکل کر اوپر بیٹھو۔
نانی بستی: تیرا جی چاہتا ہے میں بازار بیٹھوں۔ مردوئے مجھے دیکھیں۔
بیٹا: آپ کیا کہتی ہیں۔ یہاں بازار کیسا؟ کون مردوا یہاں بیٹھا ہے۔
نانی بستی: (جھانک کر) یہاں نہ سہی۔ باہر تو بھیڑ لگی ہوئی ہے۔
بیٹا: کوئی بھی نہیں ہے۔ باہر آکر دیکھو۔

---

[1] چھکی۔

بیٹے نے بڑی مشکل سے بڑی بی کو باہر نکال بنچ پر بٹھایا۔ مگر وہ اپنی کہے جاتی تھیں۔

نانی لبستی: اسی ریل کی تعریف کرتے تھے۔ ذرا دیر میں آتے تو میرا مُردہ دیکھتے۔ یہ موئی گاڑی ہے، جیسے چوہے دان۔ بھلا اس تختے کے نیچے آدمی کیوں کر بیٹھے۔ لیٹا بھی تو نہیں جاتا۔ میاں تم نے مجھ سے کب کا بدلہ لیا ہے۔ میرا تو کچومر نکل گیا۔ مجھ نگوڑی کو کب خبر تھی کہ ریل میں عورتوں کی یہ مٹی پلید ہوتی ہے۔

بیٹا: آپ نے بھی تو غضب کیا اس تختے کے نیچے لیٹ گئیں۔

نانی لبستی: اوپر پردے کی کون سی جگہ تھی۔

بیٹا: مگر یہ تو اسباب رکھنے کی جگہ ہے بیٹھنے یا لیٹنے کی نہیں۔

نانی لبستی: تو مچان پر بیٹھا گئے ہوتے۔ سیڑھی بھی تو کمبختوں نے نہیں لگائی۔ عورتیں کوئی بلّیاں ہیں کہ اچک کر چڑھ جائیں گی۔

بیٹا: جہاں اب بیٹھی ہو، یہاں کیوں نہ بیٹھیں۔

نانی لبستی: یہاں تم نے پردے باندھ دیے تھے۔ مردوں کو اپنا تماشا دکھاتی؟

بیٹا: ایسا ہی پردے کا خیال تھا تو برقع اوڑھے رہتیں۔

نانی لبستی: تمھارے تو میاں دیدے[1] ہوائی ہوگئے ہیں۔ اپنی بیوی کو اس طرح پھرانا مجھے تو معاف رکھو۔

بیٹا: تم کو تو وہم ہوگیا ہے۔ چلتی ریل میں کون آئے گا جو تمھاری

---

[1] آنکھیں بے شرم ہوگئی ہیں۔

بے پردگی ہوگی۔

نانی بستی: خیر بیٹا تم سے کون بحث کرے۔ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل کے دھماکے بھی کھانے پڑیں گے۔ اللہ ساتھ خیر کے میرٹھ پہنچا دے۔

خدا کی سنوار اس حافظے کو۔ نانی بستی کو لاکر ریل میں تو بٹھا دیا اور یہ سنانا بھول ہی گیا کہ چلنے کی جلدی میں نہانے جو بیٹھیں تو گھڑیا کے بدلے کھلے منہ کے پتیلے میں پانی سمو لیا۔ غسل خانے میں اندھیرا تھا۔ دھیان سفر میں پڑا ہوا۔ بال دھوتے دھوتے پتیلے پر نظر پڑی اس میں صورت دکھائی دی۔ بال کھلی۔ ملتانی میں لت پت۔ ننگی دھڑنگی بے تحاشا چیخ مار کر باہر بھاگیں۔ باورچی خانے سے بہو، دالان میں سے بیٹی دوڑیں "ہائیں اماں جان کیا ہوا؟"

اماں جان کا بُرا حال۔ گھگی بندھ گئی۔ پکڑ کر پلنگ پر لٹایا۔ کپڑا اُڑھایا۔ بڑی دیر میں اوسان درست ہوئے تو پوچھا "خیر تو ہے۔ کوئی نیولا تو نہیں آگیا۔" نانی بستی کی نیولے کی صورت سے جان نکلتی تھی۔ بولیں "نہیں بیٹی۔ نیولا مُوا کہاں سے آیا۔ تھو، تھو، پچھل پائی آگئی تھی۔"

بیٹی: پچھل پائی! پچھل پائی غارتن کہاں سے آئی۔ ہم تو سب سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ پرچھائیں دکھائی دی ہوگی۔

نانی بستی: لو اور سنو۔ مجھے بالکل ہی اندھا سمجھ لیا۔ یقین نہیں آتا تو جاؤ دیکھ لو۔ مُردار پتیلے میں بیٹھی ہے۔ بال بکھرے۔ ایسی

ڈراونی شکل میں نے اپنی عمر میں دیکھی نہیں۔ چڑیل نے میرا پانی بھی گندہ کر دیا۔

بیٹی بہو غسل خانے میں گئیں کہ دیکھیں پتیلے میں کیا چیز ہے جس سے یہ ڈر گئیں۔ جا کر دیکھتی ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پانی ایسا صاف ہے کہ منہ دیکھ لو۔ انھیں بھی اپنی صورتیں نظر آئیں۔ بہو زیادہ تیز تھی۔ سمجھ گئی کہ اپنا حلیہ دیکھ کر ڈر گئیں۔ نند سے کہا اور دونوں نے آ کر نانی بستی کو سمجھانا شروع کیا۔ کہ بی کون چھل بل پائی اور کیسی بھتنی؟ وہ تو خود تمھاری شکل تھی جسے پانی میں دیکھ کر تم ڈر گئیں۔ بولیں تم مجھے چلاؤ تو نہیں۔ اللہ اللہ اب میری ایسی چڑیلوں کی سی صورت ہو گئی؟" بیٹی نے لا کر آئینہ دکھایا تو کہیں جا کر سمجھیں۔

بہن کے ہاں میرٹھ میں نانی بستی نے کیا کیا شگوفے چھوڑے، ہمیں خبر نہیں۔ دوسرے وہاں ان کا رہنا ہی کے دن ہوا۔ پہلے وقتوں کی عورتیں غیر جگہ زیادہ ٹکتی ہی نہ تھیں۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ نانی بستی تیسرے روز واپس آ گئیں۔ یہاں غسل خانے میں چھل پائی کے آجانے کی داستان پڑوسیوں اور رشتے داروں کنبے والوں کو معلوم ہو گئی تھی۔ جو اُن سے ملنے آتا اس کا ذکر ضرور کرتا۔ لڑکیاں کہانی کی طرح سنتیں اور نانی بستی بُرا ماننا کیسا، اپنے بھولے منہ سے ہر ایک کو سناتیں! کہ "بنّو کیا کروں اللہ نے دل ہی ایسا بنایا ہے۔ ایک دفعہ خاصی عمر تھی۔ پرچھائیں دیکھ کر ڈر گئی چار مہینے بخار آیا۔ میاں کالے کا علاج رہا۔ کہتے ہیں کہ پرچھائیں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ دیکھو نا کیا مقدور

کہ کسی آدمی کا ساتھ چھوڑے پر چھا نوے سے تو بیٹی اچار تک میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔

کنبے میں ایک بہت شوخ بلا کی شرارت بھری لڑکی تھی۔ نام تو خاصا زبیدہ تھا۔ پیار سے 'جبو' کہہ دیتے۔ لیکن سب اسے شتابہ کہنے لگے تھے۔ اس نے جو نانی لبتی کا قصہ سنا، اس کے ہاتھ ایک نیا شگوفہ لگا۔ ایک دن برقع اوڑھ، دو حویلیوں بیچ تو رہتی ہی تھی، چپکے سے آ دھمکی۔ گرمیوں کے دن تھے، دوپہر کا وقت۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ ظہر کے وقت نانی لبتی سب سے پہلے نماز کے لیے اٹھیں۔ شتابہ نے کیا غضب ڈھایا کہ لمبا گیروا کرتا پہن۔ داڑھی لگا۔ بال بکھیر، دست پناہ ہاتھ میں لے سامنے آکھڑی ہوئی اور موٹی آواز بنا کہنے لگی۔ "لاگھی شکر دے۔" نانی لبتی کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا۔ گھگی بندھ گئی۔ خیر گزری کہ پیشاب خطا نہ ہوا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ ڈر کے مارے چیخ بھی نہ سکیں۔ ہاتھ باندھ کر اشارے سے کہا "ابھی دبتی ہوں۔ جو کہو گے دوں گی۔ خدا کے لیے باہر چلے جاؤ۔ وہیں سب کچھ پہنچ جائے گا۔"

شتابہ آخر لڑکی ہی تو تھی۔ اسے ہنسی آنے لگی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نانی کے پاس آئے برابر زینہ تھا جھٹ اوپر چڑھ کپڑے بدل نانی کے پاس آموجود۔ اور وہ حیران کہ آج کیا ہوا۔ پھر کوئی چھلاوا تو نہیں آگئی۔ شتابہ نانی سے لپٹ لپٹ کر پوچھ رہی ہے کہ نانی کون تھا کے گھی شکر دے رہی تھیں؟" نانی لبتی غریب کیا جانیں کہ سارے کرتوت اسی فتنی کے ہیں، بولیں "بیٹی تیرا

کورا[1] پنڈا ہے تو سن کر کیا کرے گی۔ دور[2] پار کچھ ایسی ویسی ہو گئی تو تیری ماں کو کیا جواب دوں گی۔" اور اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ اسی لیے تو میں رنڈیا جھینکتی رہتی ہوں کہ دوپہر کو کنڈی لگا کر سویا کرو۔ مگر کون سُنے آج ایک جوگی اندر گھس آیا تا۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ کوئی لڑکی بالی سامنے نہ تھی۔ نہیں تو مکھی بنا کر جوڑے[3] میں رکھ لیتا۔ مجھ کو دیکھ کر اپنا چمٹا بجانے اور گھی شکر مانگنے لگا۔ بمشکل ہاتھ جوڑ کر اسے باہر نکالا ہے۔ پھر سب نے ہزار سمجھایا، شتابہ نے بھی لاکھوں قسمیں کھائیں کہ نانی وہ تو میں تھی۔ نانی بستی اپنی ہی رٹ لگائے گئیں کہ بی ہوش کی بناؤ۔ کہاں یہ چار انگل کی چھوکری کہاں وہ جگادری جوگی۔ مجھے تم نے ایسا بھولا سمجھ لیا ہے۔ آنے دو اپنے بھائی کو۔ گھی شکر بھیجوں۔ اب وہ گھر کو تاک گیا ہے۔ اندھیرے اجالے آ گیا تو تمہارا کچھ نہیں جائے گا، میری موت آ جائے گی۔ بیٹی تم کیا جانو۔ ان جوگیوں میں بڑے بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ جو یہ مانگیں ان کی بھینٹ پوجا کر دینی چاہیے۔

ایک دفعہ کا ذکر سنو۔ برسات کا موسم تھا۔ بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ بہو کو شوق اُچھلا کہ قطب صاحب چلنا چاہیے۔ نانی بستی کی چاہیتی بہو۔ دنیا ٹل جائے اور بہو کا یہ کہنا نہ ٹلے بیٹے سے کہا اسے کیا انکار۔ بیوی کی فرمائش، بہنوں کا شوق اور ماں کا فرمان۔ جا کر بہلی والے کو سائی[4] دے آئے۔ رات بھر کھانے پکے۔ پکوان تلے گئے۔ صبح

---

[1] کنواری [2] خدا نہ کرے [3] بالوں [4] پیشگی

چار بجے بہلی آئی اور سب لد کر چلے۔ بہلیوں، چھکڑوں میں بیٹھ کر جانے کی بہار تانگوں اور موٹر والوں کو کہاں نصیب۔ چار پیدل ہیں دو سوار۔ جنگل آیا ایک اِدھر دوڑ رہا ہے تو ایک اُدھر گاتے بجاتے ہنستے بولتے چھم چھم مینہ برس رہا ہے۔ بھیگتے بھیگاتے چلے جا رہے ہیں۔

چار بجے کے چلے چلے دس بجے قطب پہنچے۔ بہو نے ضد کی۔ لاٹھ کے نیچے اتر پڑے۔ نانی بستی کہہ رہی ہیں۔ اللہ تیری شان۔ بنانے والوں نے کہاں بیٹھ کر بنایا ہوگا۔ بہو نے مسکرا کر کہا: "اماں جان کہتے ہیں لٹا کر بنائی تھی۔"

وہ بولیں "ہاں بیٹی اور کیا۔ اتنی لمبی۔ لہکاری لاٹھ کو سیدھا کا سیدھا کون بنا سکتا ہے۔ اچھا پھر کھڑا کیوں کر کیا؟ ہزاروں آدمی لگے ہوں گے۔ اور پھر زمین پر یہ جمی کس طرح! نہیں بیوی میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ دیکھے سے ہول آتا ہے۔" غرض کہ تھوڑی دیر لاٹھ کے اِرد گرد چکر لگا درگاہ میں حاضری دی۔ وہیں شاہ عالم کے مزار کی طرف عالمگیر کی مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو سیر سپاٹے کی سوجھی۔ بُرقعے اوڑھ درگاہ سے نکلے۔ آگے آگے چھوٹے خاں صاحب اور پیچھے پیچھے عورتوں کی قطار۔ اولیا مسجد جا رہے تھے۔ ان دنوں قطب میں نہ اتنی آبادی تھی نہ اتنی دکانیں۔ ویرانے ہی ویرانے دکھائی دیتے۔ پہلے جھرنے کی طرف نکل گئے۔ جامنیں چُن چُن کر کھائیں۔ ذرا دم لے کر چلے۔ اور سب جوان تو کچی پکی قبروں کو لانگتی پھلانگتی ہرنیوں کی طرح جاتی

تھیں۔ نانی بستی کی ٹانگوں میں اتنا دم کہاں تھا۔ دوسرے ان کا مزاج وہمی۔ کسی قبر پر بھولے چوکے پاؤں پڑا اور انھوں نے توبہ کی۔ راستے میں کیکر کی ایک ٹہنی پڑی تھی۔ اتفاق کی بات ہوا سے برقع جو اڑا تو اس ٹہنی سے جا الجھا۔ انھیں خبر نہیں۔ جب بوجھ سا معلوم ہوتا تو کہتیں نگوڑا بھیگ کر کتنا بوجھل ہو گیا ہے۔ اور کبھی "اے یہ کون گھڑی گھڑی میرا برقع پکڑ کر کھینچتا ہے۔ میں پھر کوسنے لگوں گی" کہہ کر برقع کا پلہ جھٹکنے لگتیں۔ ٹہنی کیا چھوٹتی وہ ساتھ ساتھ تھی۔ چھوٹی بیٹی کو جو ہنسی سوجھی تو اس نے کہیں پکار کر کہہ دیا کہ اماں جان تمھارے پیچھے یہ کون؟ یہ سننا تھا کہ نانی بستی کو بھوت نظر آنے لگا۔ سوکھی ہوئی ٹہنی کے زمین پر گھسٹنے کی آواز کو وہ سچ مچ چھل پائی کے چلنے کی آہٹ سمجھیں پیچھے دیکھے بغیر بھاگیں۔ جوں جوں بھاگتیں۔ ٹہنی ٹانگوں میں الجھتی۔ چیخیں مارنے لگیں۔ ہے ہے آج تو بھتنی لپٹ گئی ارے دوڑنا میری ٹانگوں کو کھا لیا" دوڑتے دوڑتے بچاری گر پڑیں۔ اتنے میں بیٹا بیٹیاں اور بہو بھی آپہنچیں، اٹھایا۔ اب آنکھیں بند ہیں اور کہہ رہی ہیں " تم نے قبرستان میں لا کر چڑیل لپٹا دی نا۔ کمبختو کہتی تھی کہ مجھے گھر میں رہنے دو۔ نہ مانا " بہو نے کہا " اماں جان چڑیل کیسی۔ نگوڑی کیکر کی ٹہنی برقع میں اٹک گئی تھی۔ دیکھیے۔ اور الجھی ہوئی ٹہنی دکھائی۔ ان چھوٹی صاحب نے آپ کو ڈرا دیا"

مغرور شہزادی

دنیا کے کسی ملک کا کوئی بادشاہ تھا، بڑا نامی نامدار، زبردست، اس کی ایک بیٹی تھی نہایت خوبصورت۔ لیکن وہ جتنی حسین اور جمیل تھی اتنی ہی مغرور، شریر اور اپنی مرضی کی مالک۔ بیسیوں بڑے بڑے شاہزادے اس سے شادی کرنے کی آرزو لے کر آتے اور ناکام اپنا منہ لے کر چلے جاتے۔ اسے کوئی پسند ہی نہیں آتا تھا۔ کسی کو اپنا جوڑ ہی نہیں سمجھتی تھی۔ اپنے گھمنڈ میں ان کی ہنسی اڑاتی، پھبتیاں کستی اور طرح طرح کے نام دھرتی۔

لڑکی جوان ہو گئی تھی۔ شادی کرنا ضروری تھا۔ آخر کب تک کنواری بیٹھی رہتی۔ بادشاہ نے سوچا کہ ایک دفعہ ہی ہر طرف کے شہزادوں کو بلایا جائے اور بھرے جلسے میں شاہزادی کو اپنا شوہر انتخاب کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی ایسا نکل آئے گا جسے وہ پسند کرے گی۔ چنانچہ ایک بڑا جشن کر کے شہزادی کے

امید واروں کو بلایا۔ جشن کا دن آیا۔ دربار لگا۔ شہزادے۔ راجکمار۔ نواب زمیندار وغیرہ اپنے اپنے درجے کے مطابق بیٹھے۔ ہر ایک اپنی اپنی وضع پر خوب بنا سنورا تھا۔ شان اور آن بان دکھانے کا اس سے بڑھ کر اور کیا موقع ہوتا۔ سب ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھے۔

جب دربار لگ گیا۔ سارے مہمان آ گئے تو شہزادی آئی اور ایک سرے سے ہر ایک کو خریداری کی نگاہ سے دیکھتی ہوئی چلی۔ بادشاہ ہوں یا فقیر۔ امیر ہوں یا غریب۔ سب ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد ہیں جیسی خدا نے صورتیں بنا دیں ویسی ہی تو ہوں گی۔ وضع وضع کی شکلیں تھیں۔ کالے بھی تھے گورے بھی۔ لمبے بھی ٹھگنے بھی۔ موٹے بھی دُبلے بھی۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق کسی کی داڑھی تھی کوئی داڑھی منڈا اعتراض کا کسی کو حق کیا ہے جیسا جس کے ملک کا رواج اور جیسا جسے اللہ میاں نے بنا دیا۔ لیکن شہزادی اس وقت بھی باز نہ آئی۔ اسے اتنا بھی دھیان نہ آیا کہ بھرے دربار میں تو زبان رُوکے رکھے۔ پھبتیاں کس کر یہاں تو کسی کا دل نہ دکھائے وہ جس کے پاس سے گزرتی آوازہ کسے بغیر نہ رہتی۔ کسی کو بے چکتی کا دُنبہ بناتی کسی کو نٹ کا بانس۔ کسی کو سڑک کوٹنے کا بیلن تو کسی کو الٹا توا۔ کسی پر بے دُم کے لنگور کی پھبتی کستی تو کسی پر بندر کے مُنہ کی۔ ایک ذرا اکڑے ہوئے تھے انھیں ٹیٹی مرغ بنا دیا۔ ایک کا چہرہ ذرا گول تھا اسے چکٹی آڑو کہہ دیا۔ ایک کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی اس پر ٹوٹی ہوئی کمان کا تیر مارا۔ دوسرے کو تنا ہوا دیکھ کر بولی یہ سوکھا ہوا ٹھنٹھ کہاں

ے آگیا۔

غرض یہ کہ اس طرح ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کہتی اور بُرے بُرے چڑاونے نام رکھتی ایک سب سے بڑے شہزادے کے سامنے پہنچی تو خوب ہنسی۔ ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ اس شہزادے کے داڑھی تھی چِکنی اور لمبی۔ اپنے ساتھ والیوں سے کہنے لگی۔ "ذرا ادھر تو دیکھو یہ مکھیاں اڑانے کی چُوری کیسی لٹک رہی ہے۔ مکھیاں تو خوب اُڑاتا ہوگا۔ خاصا داڑھی والا پہاڑی بکرا ہے۔ بکرا نہیں تو میں اسے ریشائیل ضرور کہوں گی" شہزادی کی کہی ہوئی پھبتی تو بچارے شہزادے پر پھب گئی اور ایسی پھبی کہ اس دن سے اس کا نام ہی ریشائیل مشہور ہو گیا مگر شہزادی کی یہ بات اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی۔ اس نے بہت تاؤ کھایا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا واپس اپنے ملک کو چلا گیا۔ اسے بڑا رنج تھا کہ ایک شہزادی اتنے بڑے باپ کی بیٹی اور ایسی زبان کی پھوہڑ۔ کسی کا لحاظ ہی نہیں۔ راج کے مہمانوں کے ساتھ اس قدر ذلّت آمیز سلوک!

ادھر شہزادی کے باپ بوڑھے بادشاہ کو اپنی بیٹی کی یہ حرکتیں پسند نہ آئیں بے حد غصّہ آیا بیٹی سے تو کچھ کہا نہیں لیکن دل میں عہد کر لیا۔ قسم کھالی کہ اب اس کی سزا یہ ہے کہ جو پہلا فقیر میرے دروازے پر آئے گا۔ اس کے ساتھ اس کی شادی کر دوں گا۔ چاہے یہ راضی ہو چاہے نہ ہو۔

دو دن کے بعد ایک چلتا پھرتا سارنگی بجا کر مانگنے کھانے والا فقیر ڈیوڑھی پر آگیا۔ اور محل کے جھروکے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی

سارنگی بجانے لگا اور گا بجا کر بھکاریوں کی طرح صدا لگائی دیوتاؤں کے دربار سے کچھ فقیروں کا بھی بھلا ہو جائے۔

بادشاہ پہلے تو سمجھا تھا کہ کوئی راہ گیر یا ڈوم ہوگا۔ یہ آواز سن کر حکم دیا "اندر بلاؤ"

فقیر اندر آیا تو نہایت پھٹے حالوں، پریشان داڑھی، سر کے بال الجھے ہوئے بھیانک صورت، ٹوٹی ہوئی سارنگی ہاتھ میں۔

بادشاہ : (سارنگی کی طرف اشارہ کر کے) شاہ جی یہ کیا ہے؟

فقیر : مائی باپ! بھیک مانگنے کا ٹھیکرا!

بادشاہ : تم اسے بجاتے ہو؟

فقیر : بجانا تو کیا اس کے سہارے سے پیٹ بھر لیتا ہوں۔

بادشاہ : اچھا کچھ سناؤ۔

فقیر نے محلات کی بیگمات اور بادشاہ کے سامنے کئی گیتیں بجائیں اور دعائیں دینے لگا کہ راج پاٹ سلامت رکھے۔ فقیر کی جھولی بھر دے۔

بادشاہ : سائیں صاحب تم نے ایسی اچھی سارنگی بجائی ہے کہ جھولی کیا میں تمہارا جھولا بھر دوں گا۔ ایسی چیز دیتا ہوں جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ لو اپنے ہاتھ پھیلاؤ۔ میں نے اپنی بیٹی تمہیں دی۔

سارے محل کے لوگ حیران کہ بادشاہ کو یہ کیا سوجھی شہزادی بھی وہاں موجود تھی۔ اس پر گویا بجلی گر پڑی۔ لاکھ منت کی باپ کے پاؤں پر سر رکھا۔ دوسری بیگمات نے ہزار طرح عرض معروض کی لیکن نہ شہزادی کے آنسوؤں نے بادشاہ کے دل کو پگھلایا نہ دوسروں کے کہنے سننے کا اس پر کچھ اثر ہوا۔ بہت زیادہ کہرام مچا تو بادشاہ نے سب کو ڈانٹ دیا اور

شہزادی سے کہا میں نے تیری مغرورانہ حرکتوں سے تنگ آکر عہد کیا تھا۔ کہ آج کے بعد جو پہلا فقیر میرے سامنے آئے گا اس کے ساتھ تیری شادی کردوں گا۔ چنانچہ یہ پہلا فقیر ہے اور میں اپنا عہد پورا کروں گا۔

اسی وقت ملک کے رواج کے مطابق پنڈت، قاضی، پادری جو کوئی بھی شادی کی مہر لگانے والا تھا طلب کیا گیا اور بادشاہ نے شہزادی کا اس فقیر سے بیاہ کردیا۔

ایجاب وقبول، پھیرے جو کچھ اُن کے ہاں کا دستور تھا۔ جب اس سے فراغت پائی اور شاہزادی باقاعدہ فقیر کی بیوی ہوگئی تو بادشاہ نے بیٹی سے کہا۔ "مغرور لڑکی! لے اب تیار ہوجا۔ اب تو پرایا دھن ہے۔ یہاں تیرے رہنے کا کام نہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ جہاں یہ تجھے لے جائے جا۔"

شاہزادی اور فقیر دونوں میاں بیوی پاپیادہ اسی وقت محل سے نکل کر روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کی بیٹی اور ایک فقیر کے ساتھ جوتیاں چٹخاتی خاک اڑاتی چلی جارہی تھی۔ سچ ہے غرور کا سر نیچا کیے دھول میں چلتے چلتے وہ تھوڑی دیر میں ایک گھنے جنگل سے گزرے۔ شہزادی تھک گئی تھی پوچھنے لگی یہ جنگل کس کا ہے؟

فقیر: اس جنگل کا مالک شہزادہ ریشائیل بکرے کی سی داڑھی والا ہے اگر تم اسے قبول کرلیتیں تو آج یہاں کی ملکہ ہوتیں اور جدھر چاہے اٹھتی بیٹھتیں لیکن اب کون بیٹھنے دے گا۔

شہزادی ٹھنڈا سانس لے کر کیا میرے نصیب پھوٹے ہیں۔ کاش میں اس خوفناک داڑھی والے شہزادے سے شادی کرلیتی یوں ٹھوکریں تو نہ کھاتی۔

فقیر چپ ہو گیا۔ آگے چلے اور ایسی جگہ پہنچے جہاں کھیتی ہو رہی تھی۔ کنوؤں سے رہٹ چل رہے تھے اور چاروں طرف دور دور تک سبزہ زار تھا۔

شہزادی: یہ علاقہ کس کا ہے؟

فقیر: یہ سارے لہلہاتے ہوئے باغات۔ کنوئیں کھیت کھلیان اسی ریشائیل شہزادے کے راج میں ہیں۔ اگر تم اس سے انکار نہ کرتیں تو یہ سب چیزیں تمھاری ہوتیں۔ جس کنوئیں سے چاہتیں پانی پیتیں۔ پھل کھاتیں۔ پھول توڑتیں اور جتنے آدمی یہاں ہیں تمھاری رعایا ہوتے۔

شہزادی: آہ میری تقدیر، میرا لکھا۔ مجھ نبھاگی نے کیوں نہ اس کا پلہ پکڑ لیا داڑھی والا ہی شہزادہ تو تھا۔

اب وہ ایک بڑے شہر کے پاس پہنچے۔ فصیل کے اوپر سے اونچے اونچے مکان نظر آرہے تھے۔ دروازے پر آنے جانے والوں کی بھیڑ تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی اچھی آبادی ہے۔

شہزادی: بڑی رونق کا شہر ہے۔

فقیر: ہاں یہ شہزادہ ریشائیل کی راجدھانی ہے۔ اگر تم اس کو اپنا شوہر بنا لیتیں تو اس کے برابر بیٹھ کر یہاں راج کرتیں۔

شہزادی: آہ مجھ سے زیادہ قسمت کا ہیٹا کون ہو گا۔ آئی دولت کو دھکے دے دیے میری مت کیوں ماری گئی تھی۔ میں نے اس ریشائیل راجا سے منہ پھیر کر کیا پھل پایا۔

فقیر: اب میرے آگے پچھلا رونا کیوں روتی ہو۔ میں یہ باتیں سننا نہیں چاہتا میرا کام نہیں کہ تمھارا دُکھڑا سنوں۔ جب میرے ساتھ تمھاری

شادی ہو چکی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ مذہب کے خلاف تم دوسرے مرد کی کس لیے خواہش کرتی ہو۔ کیا میں تم کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تم نے مجھ میں کیا کمی دیکھی؟

شہر کے ایک دروازے سے ہو کر دوسرے دروازے کے قریب دونوں ایک چھوٹی جھونپڑی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

شہزادی: کیسی گندی سندی۔ ٹوٹی پھوٹی فقیروں کی سی کٹیا ہے۔ یہ مرغیوں کا ڈربا کس کا ہے؟

فقیر: تمھارا گھر یہی تو ہے پہلے اس میں اکیلا میں رہتا تھا۔ آج سے ہم دونوں رہیں گے۔

شہزادی: اس میں نہ کمرے ہیں نہ بالاخانے نہ باغ نہ باغیچہ!

فقیر: کمروں بالاخانوں، باغوں اور باغیچوں سے ہمیں کیا مطلب اسی کی سنبھال ہو جائے تو بہت ہے۔

شہزادی: اور تمھارے نوکر چاکر باندی غلام کہاں ہیں؟

فقیر: ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے نوکر چاکر لونڈی غلام ہیں۔ ہمیں ان کے سوا دوسرے خدمت گاروں کی کیا حاجت؟

شہزادی: تو کام کاج کون کرے گا؟

فقیر: ہمارے ہاتھ پاؤں۔ جو کام تمھارے ہیں وہ خود تمھیں کرنے پڑیں گے۔ پرایا ہاتھ تکنا کہاں کی انسانیت ہے۔ لو اب بیٹھو نہیں۔ ایندھن موجود ہے۔ آگ جلاؤ۔ سامنے کنوئیں سے پانی لاؤ اور کھانا تیار کرو۔ میں بہت بھوکا ہوں۔

شہزادی بھلا آگ سلگانا۔ پکانا ریندھنا کیا جانتی۔ سٹپٹا گئی۔ بیزار

مصیبت فقیر کے زور ظلم اور ہاتھ بٹانے سے جیسا بُرا بھلا پکا پکایا۔ دال کچی روٹیاں جلی ہوئی۔ جتنا کھا سکے کھا کر دونوں سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ آدھی رات سے زیادہ تو اسی کھڑاگ میں گزر گئی تھی۔ شہزادی ابھی نیند بھر کر سوئی بھی نہ ہوگی کہ فقیر نے اسے جگایا اور کہا اُٹھ گھر کی جھاڑو بہارو کر پانی لا میں نہاؤں گا۔ سویرے سے ہنڈیا ڈوئی کیجیو۔ اور دیکھ دال خوب گھٹی ہوئی ہو۔ روٹی نہ کچی رہے نہ جلنے پائے۔

خدا کا دیا سر پر۔ شہزادی کو جس طرح ہو سکا سارے کام کرنے پڑے۔ نہ کرتی تو کیا کرتی۔ کہاں جاتی۔ دو دن لشتم پشتم گزرے۔ اتنے میں گھر کے اندر کھانے پکانے کا سامان ہو گیا۔ فقیر بیوی سے بولا "پہلے تو میں اکیلا تھا۔ بھیک مانگ کر بھی پیٹ پال لیا کرتا۔ لیکن اب ہم دو ہو گئے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں بھی بھیک مانگوں اور تم سے بھی بھیک منگواؤں۔ اور خالی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ کب تک یوں کام چلے گا۔ برابر خرچ کیے چلے جائیں اور کمائیں نہ دھیلا۔ تم کو چاہیے کہ ٹوکریاں بُننی شروع کر دو۔

فقیر جنگل جا کر جھاؤ کی ٹہنیوں کا گٹھا باندھ لایا۔ اور شہزادی کے آگے ڈال دیا۔ پڑوس میں ٹوکری والے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ دیکھ کر بے چاری نے ٹوکریاں بُننی شروع کیں۔ مگر دو چار ہی روز میں ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے انگلیاں زخمی ہو گئیں۔

فقیر: میں دیکھتا ہوں کہ یہ کام تمھارے بس کا نہیں ہے۔ تم چرخہ کاتو غالباً اسے تم آسانی کے ساتھ چلا لو گی۔

غریب چرخہ لے کر بیٹھی۔ فقیر نے روہڑ لا دیا۔ یہ کام کہیں شہزادیوں

سے کے ہوتے ہیں۔ مصیبت کی ماریاں جو کرتی ہیں ان کے دل سے پوچھو کہ چرخہ کاتنا مشکل ہے یا آسان۔ رد ہڑ کا تنا پہلے تو عذاب ہے۔ پھر تکلے کا سدھ رکھنا دونوں ہاتھ برابر چلیں۔ اب کبھی مال اُتر جاتی کبھی تکلا چبھ جاتا۔ گھڑی گھڑی تار ٹوٹتے۔ ایک پونی بھی پوری نہیں کتی تھی کہ انگلیاں چھد گئیں اور ان میں سے خون بہنے لگا۔

فقیر: (تیوری چڑھاکر) میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔ تم تو بالکل نکمی نکلیں کوئی کام نہیں کرسکتیں۔ تم سے شادی کرکے میں نے اچھی کمائی کی اچھا اب کوئی اور دھندا نکالوں گا۔ یہ تو ہوگا نہیں کہ تم کو یوں ہی بیٹھ کر کھلاؤں۔ گانو جاکر مٹی کی ہنڈیاں۔ صراحیاں۔ مٹکے ٹھلیاں لادوں گا۔ تم بازار میں کھڑے ہو کر انھیں بیچنا۔

شہزادی: (ٹھنڈا سانس لے کر) اب میرا یہ لکھا پورا کردگے۔ جب میں بازار میں کھڑی ہوں گی اگر میرے باپ کا کوئی نوکر چاکر اُدھر نکل آیا اور مجھے اس طرح دیکھا تو وہ کیا کہے گا۔ میری کیسی ہنسی اڑائے گا۔

فقیر نے شہزادی کے اس کہنے اور رونکھی صورت۔ بنانے کی ذرا پروا نہیں کی۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں اور کہنے لگا:" بس کل میں یہ سب سامان تمھیں لادوں گا اور اگر تمھیں بھوکا نہیں مرنا تو سر بازار کھڑے ہو کر برتن بیچنے پڑیں گے۔

صبح ہی فقیر نے برتنوں کا ڈھیر لگا دیا مارے باندھے کا سودا تھا۔ شہزادی دل میں اندر ہی اندر روئی۔ برتن لے بازار میں جا کھڑی ہوئی اوّل اوّل خوب دکان پر بھیڑ رہی۔ ایک خوبصورت جوان عورت کو دیکھ کر جو اُدھر سے گزرتا کھڑا ہو جاتا۔ ایسی انوکھی کمھاری شہر میں آجائے

اور بانکے ترچھے اسے نہ گھیریں، روپیا برسنے لگا۔ جو دام وہ کہتی بلا حجت دیتے مٹی کے برتنوں کی خریداری کیسی یہ تو اس کی منہ دکھائی تھی۔

شام تک سارے برتن بک گئے۔ دوسرے دن فقیر اور بہت سے برتن لے آیا اب کے شہزادی بازار کے ایک کونے میں دکان لگا کر بیٹھی۔ بیٹھے دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ ایک شرابی سوار گھوڑا بھگاتا آیا اور شہزادی کی دکان کو روندتا نکل گیا۔ برتن ٹوٹ کر ٹھیکرے ہو گئے۔ ایک آبخورہ تک سلامت نہ بچا شہزادی اینٹ کا گھر مٹی دیکھ کر رونے لگی۔ رونے کے سوا اور کیا کرتی۔ اس ناگہانی آفت کا اس کے پاس کیا علاج تھا۔ کہنے لگی اب کیا ہوگا؟ دیکھیے میرا کیا درجہ ہوتا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں؟ خدا ہی ہے جو آج عزت بچے!" لیکن وہاں ٹھیکروں پر بیٹھی کب تک آنسو بہایا کرتی۔ ڈرتی کانپتی گھر آئی اور جو کچھ گزرا تھا فقیر کو سنا دیا۔

فقیر: (آنکھیں بدل کر) بازار کو اپنے باوا کا گھر سمجھ لیا تھا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم اس کام کے قابل بھی نہیں۔ بھلا اس سے زیادہ گدھاپن اور کیا ہوگا۔ کہ بازار کے موڑ پر دکان لگائی اور دکان بھی لوہے لکڑی کی نہیں مٹی کے برتنوں کی جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے چورا ہو جائیں۔ تم یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمدورفت ہے۔ خیر اب اس رونے جھیکنے سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہو گیا کہ تم اس قسم کا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں۔ اچھا میں شاہی محل جاتا ہوں۔ وہاں دریافت کروں گا۔ شاید باورچی خانے میں کسی کام کرنے والی کی ضرورت ہو۔ اگر کوئی جگہ خالی ہوئی اور انھوں نے تمھیں رکھ لیا تو روٹیوں کی

کمی نہیں رہے گی۔ تم باورچی خانے کی جھوٹ چھاٹ سے پیٹ بھر لینا اور تمھاری تنخواہ سے میں گزارا کر لوں گا۔

فقیر گیا اور تھوڑی دیر میں شہزادی کو لے جا کر راج محل میں چھوڑ آیا۔ بادشاہ کی بیٹی برتن مانجھنے والی بن گئی اور کھانا پکانے والیوں کے ہاتھ کے نیچے بڑے سے بڑے اور گندے سے گندے کام کرنے لگی۔ رات کو گھر آنے کی اجازت مل جاتی اور باورچی خانے کی داروغن ترس کھا کر گھر لے جانے کے لیے بھی اسے ایک آدمی کا پیٹ بھر اد کھانا دے دیتی۔ اس طرح دونوں میاں بیوی کا گزارا ہونے لگا۔

راج محل میں رہتے اور باورچی خانے کی نوکری کرتے دو چار ہی دن ہوئے ہوں گے شہزادی نے سنا کہ بادشاہ کا بڑا لڑکا دلھن بیاہنے جا رہا ہے۔ اس محل کے نیچے سے برات گزرے گی۔ امیر ہوں یا غریب بوڑھی ہوں یا جوان عورتیں عام طور پر دولھا کو دیکھنے کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ شہزادی کان لگائے بیٹھی رہی۔ جونہی باجے گاجے کی آواز آئی نفیریاں تاشے سنائی دیئے۔ باورچی خانے کے باہر کی طرف والی کھڑکی کھول جا کھڑی ہوئی اور برات کا تماشا دیکھنے لگی بڑی دھوم دھام تھی۔ بڑا کرّوفر تھا۔ سونے کی عماریوں کے ہاتھی۔ زرّیں چار جامے کسے ہوئے گھوڑے دربار کے امیر وزیر۔ فوج کے سردار ملک کے ٹھاکر زمیندار زرق برق پوشاکیں پہنے دولھا کے ساتھ تھے۔

شہزادی کو یہ سماں دیکھ کر بہت ملال ہوا۔ اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لے کر آپ ہی آپ بولی۔ میں نے اپنا نصیب اپنے ہاتھ سے پھوڑ لیا۔ اگر میں

غرور نہ کرتی تو اس درجے کو نہ پہنچتی۔ اتنے شہزادے اور نواب زادے آئے تھے۔ ان میں سے کسی کو پسند کرلیتی۔ اس داڑھی والے شہزادے میں آخر کیا برائی تھی۔ صورت شکل نہ سہی شہزادہ تو تھا۔ فقیر کے پلّے تو نہ پڑتی۔ محلوں میں اجنبی لونڈیوں کی طرح دوسروں کے آگے پیچھے تو نہ پھرتی۔ میرے غرور نے مجھے یہ نیچا دکھایا اس لیے آج سب سے زیادہ ذلیل ہوں۔"

جلوس ابھی جھروکوں کے نیچے ہی تھا کہ باورچی خانے کی داروغہ نے آواز دی۔ شادی کا کھانا تھا۔ آج اسے بہت سا دیا اور کہا کہ اب یہاں کوئی کام نہیں اپنے گھر جا اور کھاپی کر سویرے سے آ بیٹھو۔"

شہزادی کھانا لیے ہوئے گھر جانے کے ارادے سے دروازے پر آئی دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ شہزادہ دولھا بنا ہوا سامنے آگیا۔ اور اس نے جو ایک خوبصورت عورت کو دیکھا تو آنکھوں میں نور اتر آیا۔ ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ "کہاں چلیں؟ میرے ساتھ آؤ۔ شادی کے جلسے میں کیا شریک نہیں ہو گی۔ تم کو میرے پاس بیٹھنا پڑے گا۔"

شہزادی نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو دولھا ریشائیل شہزادہ تھا۔ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگی اور ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ لیکن شہزادے نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ خوب مضبوط پکڑ لیا اور اسے اندر محل میں لے گیا۔

محل میں پہنچ کر شہزادی کے پانو لڑکھڑائے، سر سے کھانے کی سینی گر پڑی اور جو کچھ وہ باورچی خانے سے لائی تھی سب فرش پر بکھر گیا۔

ایسے موقعوں پر دیکھنے والوں کو ہنسی آتی ہی ہے۔ شہزادے کے ساتھ جو لوگ تھے بے تحاشا ہنسنے لگے اور مالک کو جو خوش دیکھا تو اور بھی تالیاں بجا بجا کر ہنسے۔ شہزادی پر ہزاروں گھڑے پانی کے پڑ گئے شرم کے مارے آنکھ نہیں اٹھتی تھی بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے آنکھ بچا کر بھاگی۔ ابھی غلام گردش میں تھی کہ شہزادہ ریشائیل نے پھر جا پکڑا۔ واپس لایا اور کہنے لگا۔ ڈرو نہیں۔ مجھ سے بھاگتی ہو؟ مجھے پہچانا بھی؟

شہزادی: آپ شہزادے ہیں!

شہزادہ: (مسکرا کر) ریشائیل یہ تمھارا دیا ہوا خطاب ہے۔ میں ہی گویا سارنگی والا فقیر ہوں۔ تم بھول گئیں۔ مجھ کو تم سے محبت تھی۔ میں نے روپ بنایا اس لیے کہ اس کے سوا تمھارے ہاتھ آنے کا کوئی کارن نہ تھا۔ پھر میں نے دانستہ تم کو ایک چھوٹی سی کٹیا میں رکھا۔ تم سے مختلف دُکھ دینے والے کام لیے اور وہ سوار بھی میں ہی ہوں۔ جس نے تمھاری دکان کے سارے برتن توڑ ڈالے تھے اب تم مجھ سے پوچھو کہ ایسے بُرے برتاو میں نے تمھارے ساتھ کیوں کیے؟ میں نے یہ جتنی باتیں تمھارے ساتھ کیں محض تمھارے غرور کی بیماری کھونے کی غرض سے میں جانتا تھا کہ جب تم میرے راج پاٹ کی شریک بنو تو آدمی بن کر۔ تمھارا دماغ بالکل صحیح ہو جائے۔ تم اپنی ساری بُری حرکتیں چھوڑ دو۔ یہ تمھارے حق میں قدرت کی طرف سے ایک سزا مقرر تھی تمھارے سدھارنے اور تمھاری عقل ٹھکانے پر لانے کے لیے یہ چند دن کے سبق تھے۔ تم نے جو پھبتیاں دوسروں پر اور مجھ پر اڑائی تھیں اور حقارت کے برتاو کیے تھے اس کا خمیازہ تم کو بھگتنا چاہیے چنانچہ تم بھٹی میں پڑ کر کندن ہو گئیں۔ غرور کا جھوٹا ملمع اتر گیا۔ تم کو عقل آ گئی۔

سارے غلط گمان۔ حسن و دولت کے تمام گھمنڈ جاتے رہے اور خدا کی مہربانی سے وہ وقت آگیا تم ملکہ کہلاؤ اور اپنی شادی کے جلسے دیکھو۔"

اسی وقت محلات کا مہتمم توشے خانے کے داروغہ کو لے کر حاضر ہوا۔ بڑی بڑی کشتیوں میں قسم قسم کے زیور اور لباس تھے۔ پیش خدمتوں نے شہزادی کو نہلا دھلا آراستہ کر دلھن بنا دیا۔ شہزادے نے شہزادی کے ماں باپ اور اُس کے درباریوں کو بھی بلا رکھا تھا۔ پہلو کے کمرے سے وہ نکل آئے۔ ہر طرف مبارک سلامت کی دھوم مچ گئی۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور شہزادی فقیرنی سے ملکہ بن گئی۔

ہیرامن توتا

ایک چڑی مار قسمت کا ہیٹا منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا۔ دن بھر بھوکا پیاسا جال بچھائے جنگل میں بیٹھا رہتا۔ شام تک مشکل سے دو چار جنگلی پرندے پھنستے۔ غریب کو وہی غنیمت ہوتے۔ کوئی خدا کا بندہ دو چار پیسے دے کر چھڑوا دیتا یا ترس کھا کر خرید لیتا۔ تو کہیں روکھی سوکھی سے پیٹ بھرتا۔ کبھی کئی کئی دن تک فاقے بھی ہو جاتے۔ کوئی جانور ہی نہ آتا اور آتا بھی تو ایسا کہ نہ صدقے کے کام کا نہ کھانے پالنے کے مطلب کا۔ چنے چبانے کے لیے پیسے نہ ملتے۔ دونوں میاں بیوی تو پیٹ پر پتھر باندھ کر صبر بھی کر لیتے مگر ناسمجھ چھوٹے بچے بلکتے رہ جاتے۔

اسی طرح جھینکتے پیٹتے بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن چڑی مار کی بیوی کہنے لگی دیکھنا کہیں یہ بپتا ہم پر اس لیے تو نہیں پڑی کہ ہم بے زبان جانوروں کا صبر سمیٹتے ہیں۔ خدا جانے کیسے ظالموں کے ہاتھ پڑتے ہوں گے۔ وہ بچارے اپنے گھروں سے بے گھر اور بال بچوں سے الگ بچھڑتے ہیں۔ اور ظلم اٹھاتے ہیں سو جدا۔

چڑی مار: مگر کریں تو کیا کریں۔ باپ دادا سے یہی پیشہ چلا آتا

ہے۔ خدا نے اسی میں ہمارا رزق اتارا ہے

بیوی : اچھا ایک کام تو کیا کرو۔ جو جانور بکنے سے رہ جائیں ان کے دانے پانی کا تو خیال رکھو۔

چڑی مار : اپنے ہی بچوں کا پیٹ نہیں پلتا۔ ان کے لیے کہاں سے آئے۔

بیوی : پھر جو کھانے کو ہوں انھیں کھا ہی لیا کریں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ پھٹکی میں پھڑک پھڑک کر مر جاتے ہیں۔

چڑی مار : یہ تو ہمارے ہاں قسم ہے۔ اور سب جانور کھانے کے بھی تو نہیں ہوتے۔

بیوی : تم قسم کو لیے پھرتے ہو۔ فاقوں میں تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کو چھوڑ دو۔ بچے تو فاقے نہیں مریں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا بیوی کی یہ بات چڑی مار کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اس نے ہامی بھر لی اور کہا۔ خیر تم جاؤ۔ کل سے یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ اور کچھ نہیں تو بھوکے رہنے ہی سے بچ جائیں گے۔

دوسرے دن حسب معمول چڑی مار پھٹکی[1]، جال کپا[2] اور لاسا[3] لے جنگل پہنچا۔ اتفاق کی بات کہ شام ہونے آئی اور چھوٹا بڑا اچھا برا کوئی پرندہ نہ پھنسا مایوس ہو کر اپنا سامان سمیٹ رہا تھا کہ ایک نئی وضع کا نہایت خوبصورت توتا جال میں آگیا۔ چڑی مار کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ آج قسمت کھل گئی۔ منہ مانگے دام

---

[1] پنجرہ جس میں چڑی مار چڑیاں پکڑ کر ڈالتے ہیں۔ [2] لاسے دار لکڑی جس سے پرندوں کو پکڑتے ہیں۔ [3] جانوروں کو پکڑنے کی لعاب دار شے۔

بھی نہ ملے تو دو چار روپے کہیں گئے نہیں۔ شہر آیا تو دیکھا ہڑتال ہے کوئی گاہک نہ ملا۔ رات ہو گئی تھی۔ تقدیر کو جھینکتا گھر کا راستہ لیا۔ بیوی منتظر تھی دیکھتے ہی بولی کہو کیا لائے؟

چڑی مار: اری ہمارے نصیب میں تو فاقے ہیں لائے کیا؟ آج یہ توتا ملا تھا تو گاہک نہیں ملا۔ خدا کی مار ان ہڑتالوں پر۔ غریب کہاں سے کھائیں، چوک پر چڑیا کا بچہ بھی نہیں۔ سارا شہر بند پڑا ہے۔

بیوی: تو پھر کیا ہوا ہنڈیا تو چڑھ جائے گی۔

چڑی مار: توتا کھائے گی؟ ایک تو کھانے کی چیز نہیں دوسرے گوشت کتنا نکلے گا اس میں تو بڑی ہی پڑ ہوتے ہیں۔

بیوی: بس تم بیٹھے رہو۔ میں پڑوسن سے لون مرچ اور آٹا بھی مانگ لاتی ہوں۔ آج تو اسے پکانا ہے۔ چاہے بوٹی بوٹی بھی حصے میں نہ آئے۔ یہ کہہ کر عورت پھٹکی کے پاس گئی کہ توتے کو نکالے۔ توتا معمولی توتا نہ تھا، ہزار داستان۔ پرستان کا جانور۔ اس نے جو سنا کہ عورت اپنی ضد پر اتر آئی ہے۔ بغیر ہنڈیا گرم کیے نہیں رہے گی۔ گھبرا کر بولا۔ "مائی ان مٹھی بھر پروں کو پکا کر کیا کرے گی۔ میرے گوشت میں کیا مزہ۔ مال مسالہ بھی رائیگاں جائے گا روکھی سوکھی روٹی کھا کر رات کاٹ دے۔ مجھے حلال نہ کر۔ تم چڑی مار میری قدر کیا جانو۔ نصیب کے دھنی تھے۔ جو ہیرا من تمہارے جال میں پھنس گیا۔ ایک بوٹی اور چلو بھر شوربے کے لالچ میں گھر میں آئی ہوئی لچھمی کو ہاتھ سے نہ کھو اور اتنا صبر نہیں تو صبح بادشاہ کی خدمت میں مجھے پیش کر دو تو تمہارے دلدر پار ہو جائیں گے۔"

عورت نے جو توتے کو اس طرح بولتے سنا تو حق حیران کہ جانور کیسا

واقعی بولتی چڑیا ہے۔ ادھر چڑی مار بھی توتے کی باتوں سے متعجب ہو کر اٹھ بیٹھا وہ اپنے بڑوں سے ہیرامن توتے کی کہانیاں سے ہوئے تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ ہیرامن توتا ہے۔ اور خدا نے ہمارے دن پھیر دیے۔ کیسا پکا تار بیدھنا اور کس کا سونا۔ دونوں میاں بیوی صبح کے انتظار میں جاگتے اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتے رہے۔ خدا خدا کر کے دن نکلا۔ چڑی مار نہا دھو، اُجلے کپڑے پہن، توتے کا پنجرہ لے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور توتے کا پنجرہ پیش کیا۔ پرستان کا توتا جسے سبز پری بادشاہ دیکھتے ہی عاشق ہو گیا۔ قیمت پوچھی چڑی مار کچھ کہنے ہی کو تھا کر توتا بولا "حضور انمول چیز کا مول کیا۔ راجا اندر کے باغ کی چڑیا ہوں۔ نصیب کی گردش سے اس غریب کے پھندے میں پھنس گیا۔ ایک رات اندھیری گزری۔ صبح سے پھر ستارہ چمک اٹھا۔ خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ اب جو آپ کی خدمت میں ہوں۔ یہ غریب مجھے کیا جانے لیکن میرے صدقے میں اس کے بال بچے پل جائیں گے۔"

بادشاہ پہلے تو صورت پر فریفتہ ہوا تھا۔ یہ مچھے دار گفتگو جو سنی تو بالکل ہی لٹو ہو گیا۔ خزانچی کو حکم دیا کہ چڑی مار کی پھٹکی میں جتنی اشرفیاں آئیں دے دو۔ ادھر تو چڑی مار نہال نہال اپنے گھر روانہ ہوا اور اُدھر بادشاہ توتے کا پنجرہ ہاتھ میں لے اپنی خوابگاہ[1] میں آیا۔ رنگ برنگ کی بولیاں اور مُلک مُلک کے قصے سن کر دنگ[2] ہوا جاتا تھا۔ غرض کہ توتے نے بادشاہ کو ایسا موہ[3] لیا اور بادشاہ توتے کا ایسا گرویدہ ہوا کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ آٹھوں پہر توتا ہوتا اور بادشاہ۔ سلطنت کا کاروبار تو ایک طرف جا پڑتی

---

[1] سونے کا کمرہ۔ [2] حیران۔ [3] اپنا کر لیا۔

سے چاہیتی بیگم تک سے بات نہ کرتا۔

عورتیں غریبوں کی ہوں یا امیروں کی حسد اُن کے دل میں داخل ہے۔ شوہر کے مقابلے میں انسان تو انسان انھیں جانور تک سے بیر ہو جاتا ہے۔ اس بادشاہ کی کئی بیویاں تھیں۔ توتے اور بادشاہ کی محبت دیکھ کر اندر ہی اندر جلنے لگیں۔ سمجھیں کہ توتے میں کوئی بھید ہے جو بادشاہ کا دل ہم سے پھر گیا۔ غریب توتے کی دشمنی میں سب ایک ہو گئیں۔ مشورے ہونے لگے کہ کسی طرح اس سبز قدم[1] کا کام تمام کرنا چاہیے۔ سوکناپے کی آگ جب بھڑکتی ہے تو مرے یا مارے بغیر نہیں بجھتی۔ ہر وقت اس تاک میں رہتی تھیں کب موقع ملے اور بچارے کی ٹانگیں چیریں۔ لیکن بادشاہ سلامت توتے کو اکیلا چھوڑتے تو ان کی مراد بر آتی وہ محل میں رہتے تو آنکھوں کے سامنے رکھتے۔ باہر نکلتے تو ساتھ لے جاتے۔

اتفاق کی بات بادشاہ کو کسی مہم پر جانا پڑا اور کچھ ایسی پریشانی ہوئی کہ توتے کا پنجرہ رہ گیا۔ بیگموں کو ایسا موقع خدا دے۔ اب کیا کریں کوئی بہانہ بھی تو ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپس میں بھی تو سوکناپے کی لاگ ڈانٹ تھی۔ ڈر تھا کہ اپنی سُرخروئی کے لیے کوئی بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ الٹی ہم پر ہی مصیبت آجائے اس لیے سب میں جو زیادہ چلتی ہوئی تھی۔ اس نے صلاح دی کہ آؤ توتے سے پوچھیں کہ ہم میں خوبصورت کون ہے۔ منشا یہ تھا کہ ایک نہ ایک بدصورت ضرور ٹھہرے گی۔ بس اسی کے ہاتھوں اس کی موت ہے۔ جھٹ بادشاہ کی خواب گاہ میں پہنچیں۔ اور ہیرامن سے کہنے

---

[1] منحوس

لگیں میاں مٹھو! تمھاری شناخت کی بڑی دھوم ہے۔ کہتے ہیں کہ تم نے دنیا کی بہت سیریں کی ہیں، ہم تو جب جانیں یہ بتاؤ ہم میں سے تم کس کو پسند کرتے ہو۔"

توتا ان کی نگاہوں سے تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ایسے ایسے تریا چرتر اس کی چٹکیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ سنبھل کر بولا جناب میں نے آپ سب کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ پنجرے کے اندر بند ہوں۔ اگر میری نظر کا امتحان ہی منظور ہے۔ تو مجھے پنجرے سے نکالیے۔ میں ایک ایک کے پاس آؤں سر سے پاؤں تک دیکھوں۔ پھر بتا سکتا ہوں کہ کون سب سے بڑھ کر خوبصورت ہے۔ پہلے تو یہ ڈریں کہ پنچھی کا کیا بھروسا، جل دے کر اڑ گیا تو اور آفت آئی۔ لیکن وہی حرافہ جس کی یہ تجویز تھی اپنا منصوبہ بگڑتے دیکھ کر چپکے سے بولی "بوا! سوچ کس بات کا ہے کمرے کے سارے دریچے اچھی طرح بند کر دو۔ مؤا اڑ کر جائے گا کہاں۔ ہم اتنی ہیں منڈیا مروڑ کر رکھ دیں گے!" چنانچہ اپنی دانست میں پورا بندوبست کر کے توتے کو پنجرے سے باہر نکالا ہیرامن کمرے میں چاروں طرف اڑنے لگا۔ اِدھر تو اس نے اپنے پروں کو کھول لیا اور اُدھر ایک روشن دان پر بھی نگاہ پڑ گئی جو کھلا رہ گیا تھا۔

شاہزادیاں بے تاب تھیں۔ بار بار اپنا سوال دہراتی تھیں مگر میاں مٹھو برابر ٹال کر کاٹے جاتے تھے۔ آخر ایک دفعہ ہی ہیرامن آنکھیں پھیر کر بولا کیا بکواس لگائی ہے چڑیلوں جیسی شکلیں اور یہ ناز، سات سمندر پار والی شہزادی کی لونڈیاں بھی تم سب سے ہزار درجے حسین ہیں۔ اتنی بڑی بات

ل عورتوں کی چالیں۔ ٹالم ٹول۔

طوطے سے سن کر بادشاہ کی بیویاں کیونکر آپے میں رہتیں۔ سب ہلّہ کر کے جھپٹیں کہ ایک ایک پَر نوچ ڈالیں۔ یہ اُچکا ہی کیں اور ہیرامن فرّاٹا بھر روشن دان میں سے نکل یہ جا وہ جا۔ ساری کی ساری ہاتھ ملتی اور ایک ایک کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

شاہی محل کے پچھواڑے دریا کے قریب ایک لکڑہارے کی جھونپڑی تھی۔ ہیرامن اُڑ کر وہاں جا بیٹھا۔ لکڑہارے کی بیوی نے جو ایک نئی طرح کا طوطا دیکھا جھٹ دوپٹا ڈال کر پکڑ لیا۔ بچاری بے اولاد تھی۔ طوطے کی باتوں سے جی بہلانے لگی۔

اب بادشاہ کی سنو۔ ہیرامن کے بغیر سفر عذاب ہو گیا۔ آٹھ دس دن جوں توں کر کے گزرے۔ اور ہارا مارا الٹا یا سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ دیکھا تو پنجرہ خالی۔ آئے تو جائے کہاں اندر باہر قیامت آگئی۔ لونڈیاں، باندیاں، نوکر چاکر سہمے سہمے پھرتے تھے مگر کوئی نہیں بتاتا تھا کہ طوطا کہاں گیا۔ جب کسی طرح طوطے کے غائب ہونے کا راز نہ کھلا تو حکم دیا شہر میں گلی گلی کوچے کوچے ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ جو ہمارے طوطے کا پتا بتلائے گا۔ اسے پکڑ کر ہمارے پاس لائے گا جو مانگے گا وہ پائے گا۔

لکڑہارے نے بھی ڈھنڈورے کی آواز سنی۔ بیوی سے بولا کہ ہو نہ ہو بادشاہ والا طوطا یہی ہے۔ چلو خدا نے ہمیں گھر بیٹھے دولت دی۔ بیوی راضی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن انعام کا لالچ اور حکم کا ڈر جلدی جلدی طوطے کو لے شاہی ڈیوڑھی پر جا خبر کی۔ دربان دوڑے بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ہیرامن آگیا۔ باغ باغ ہو گیا۔ ہزاروں روپے لکڑہارے کو انعام دیے۔ لکڑہارا تو غریب سے امیر ہو کر اپنے گھر کو چلا اور یہاں بادشاہ نے اکیلے میں طوطے کو آنکھیں دکھا کر کہا۔

"ہیرامن! آخر توتے کی ذات ہونا بے مروت۔ میری اتنی محبت کا بھی خیال نہ آیا" توتے نے جواب دیا "حضور جو کہیں سر آنکھوں پر لیکن قصور معاف ہم جانوروں کو کوئی کیسا ہی بے مروت۔ نا آشنا اور کم ظرف کہہ لے۔ پھر بھی انسان جیسے حسد کرنے والے احسان فراموش اور ظالم نہیں اور ساری داستان سنادی کہ حضور کے اقبال سے جان رہ گئی ورنہ کبھی کا صدقے ہو گیا ہوتا۔ توتے نے کچھ ایسی لسانی سے بیگموں کی دشمنی اور سات سمندر والی شہزادی کا قصہ بیان کیا کہ ایک طرف تو ان سب کی صورت سے نفرت دوسری طرف اس شہزادی کے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ راج ہٹ[1] بھی خدا کا قہر ہوتا ہے۔ فوراً بیگموں کو آبادی سے دور جنگل بیابان میں چھڑوا دیا۔ اور توتے سے کہا کہ اگر اپنی اور میری سلامتی چاہتا ہے تو مجھے اس شہزادی تک پہنچا۔

ہیرامن بولا بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس خیال سے باز آئیں۔ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں اور اگر آپ کو یہی ضد ہے تو خیر جیسا میں کہوں ویسا سامان مہیا کریں۔ میں حاضر ہوں اس کے محلوں میں پہنچا دوں گا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔

بادشاہ نے پوچھا وہ کیا سامان ہے؟ توتا بولا۔ ایک پر دار گھوڑا مہیا کیجیے۔ بادشاہ بہت سٹپٹایا کہ پر دار گھوڑا کہاں سے آئے۔ توتے نے بادشاہ کو پریشان دیکھ کر کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں مجھے اصطبل میں لے چلیے جس گھوڑے کو میں پسند کروں اسے کہیں الگ رکھیے اور روزانہ اکیلے میرے ساتھ چل کر جو بوٹیاں میں بتاؤں وہ لائیے! اور اپنے ہاتھ سے اس گھوڑے کو کھلائیے۔ پھر خدا کی قدرت

---

[1] بادشاہ کی ضد۔

کا تماشا دیکھیے۔

چنانچہ ایک گھوڑا چھانٹ کر الگ رکھا گیا اور جیسی بوٹیاں توتا کہتا گیا۔ بادشاہ لا لا کر کھلاتا رہا۔ چند روز میں کیا دیکھتے ہیں کہ گھوڑے کے پَر نکل آئے اور اس کے جسم میں بجلی سی کوندنے لگی۔ جب گھوڑا ہیرامن کی مرضی کے مطابق تیار ہو گیا تو بادشاہ سے کہا کہ سواری تو ہو گئی اب آپ چاندی کے چھوٹے چھوٹے بہت سے پھول بنوایئے اور سفر کا دوسرا ضروری سامان کر کے چلیے۔ حکم کی دیر تھی پھول بھی بن کر آ گئے خرجیوں میں روپے اشرفیاں بھریں بادشاہ گھوڑے پر اور ہیرامن بادشاہ کے کندھے پر، دونوں شہر سے نکل جنگل میں پہنچے تو توتا بولا۔ اب ہمارا اصلی سفر شروع ہوتا ہے۔ ایک چابک گھوڑے کو لگایئے۔ لیکن یاد رکھیے کہ دوسرا ہاتھ نہ اٹھے۔ اگر آپ نے جلد بازی سے یا بگڑ کر دوسرا چابک لگا دیا تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا چابک لگنا تھا کہ گھوڑا اپر کھول کر اُڑا اور ہوا میں تیرتا ہوا بجلی کی تیزی کے ساتھ چلا جنگل، پہاڑ، دریا، میدان اور سمندر آنکھوں کے نیچے سے نکلے جاتے تھے۔ چلتے چلتے شام کے لگ بھگ گھوڑا ایک عجیب و غریب عالی شان محل کے سامنے زمین پر اترا۔ محل سے تھوڑی دور ایک بہت اونچا نہایت گھن دار درخت تھا۔ ہیرامن نے بادشاہ سے کہا کہ مبارک ہو منزل مقصود آ گئی۔ شہزادی کا محل یہیں ہے۔ آپ اطمینان سے گھوڑے کو باندھ کر یہاں آرام فرمائیں۔ جی چاہے تو میوہ بھی کھا لیں۔ میں ذرا محل کی سن گن لے آؤں۔ تعجب نہیں کہ آج ہی آپ کا مطلب پورا ہو جائے۔

بادشاہ تو کھانے پینے میں مشغول ہوا۔ توتے نے یہ کام کیا کہ محل سے لے کر اس درخت تک چاندی کے پھول بکھیر دیے۔ اور درخت کی

پھننگ پر بیٹھ کر بادشاہ کو آواز دی کہ آپ بھی پتّوں میں چھُپ کر کسی گدّے پر چڑھ بیٹھیے۔ شہزادی کا معمول تھا کہ چاندنی رات میں سیر کو نکلا کرتی تھی۔ آدھی رات ہوئی تو محل کا چور دروازہ کھُلا اور شہزادی دو چار لونڈیوں کے ساتھ چاندنی کی بہار دیکھنے باہر آئی۔ عجب سماں دیکھا کہ زمین پر دُور تک ستارے سے چمک رہے ہیں۔ اٹھائے تو چاندی کے پھول تھے۔ بھولی شہزادی انھیں سمیٹ سمیٹ کر اپنے آنچل میں جمع کرنے لگی۔ اور بڑھتے بڑھتے درخت کے نیچے تک آ گئی۔ وہاں گھوڑا بندھا ہوا تھا چونکی اور الٹے قدموں جانا چاہتی تھی کہ ہیرامن نے اشارہ کیا اور بادشاہ کود سامنے آیا۔ لونڈیاں تو چیخیں مارتی ہوئی بھاگیں شہزادی منہ دیکھنے لگی۔ بادشاہ کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر توتے نے ڈانٹ کر کہا مورکھ دیکھتا کیا ہے اپنا کام کر!" یہ سنتے ہی بادشاہ نے شہزادی کو لی بھر گھوڑے پر بٹھایا اور سوار ہو ایک چابک رسید کیا۔ گھوڑا پھر ہوا ہو گیا۔

شہزادی اس کارروائی سے سہم کر بیہوش ہو گئی تھی۔ بادشاہ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ گھبراہٹ اور جلدی میں گھوڑے کو ایک چابک اور لگا دیا۔ کہ رفتار میں تیزی آ جائے اور گھر پہنچ کر اس کے ہوش میں لانے کا بندوبست کریں۔ بادشاہ کو یہ بالکل یاد نہیں رہا کہ توتے نے کیا کہا تھا۔ اور دوسرا چابک مارنا طلسم کے قاعدے کے خلاف ہے۔ چابک کیا پڑا کہ شامت آ گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ گھوڑے سے پروں کی طاقت جاتی رہی۔ مٹی کا تھوا ہو گیا۔ بجائے آگے بڑھنے کے الٹا نیچے کی طرف چلا اور پلک جھپکتے گھوڑا اور تینوں لق و دق میدان میں آ پڑے۔ ہیرامن بہت پھڑپھڑایا۔ چیخا چلایا کہ رے نادان! یہ کیا غضب کیا اپنے سے مصیبت مول لی۔ کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

اب دیکھیے کیا کیا آفتیں آتی ہیں۔ خدا جانے یہ کون سا ملک ہے اور کس کی عمل داری"۔

رات کا وقت چاند بھی ڈوب چکا تھا۔ چاروں طرف بالکل اندھیرا۔ بادشاہ شرمندہ گھوڑا بے کار۔ شہزادی بیہوش نہ کوئی یار نہ مددگار۔ تھوڑی دیر توتا ملامت کرتا رہا اور بادشاہ سُنا کیا۔ اس کے بعد وہ مثل مشہور ہے کہ مایوسی میں نیند خوب آتی ہے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا جو لگی تو بادشاہ سو گیا اور ایسا سویا کہ کروٹ نہ لی قدرت کو نیا کرشمہ دکھانا مقصود تھا اس علاقے کا شہزادہ وہیں کہیں شکار کی گھات میں پڑا ہوا تھا۔ صبح ہی ایک ہرن کا پیچھا کرتا اُدھر سے گزرا۔ بادشاہ پر نظر پڑی کہ بے خبر سو رہا ہے۔ پھر شہزادی کو دیکھا بال پریشان بیہوشی کی حالت نیت میں کھوٹ آئی۔ چپکے سے اٹھا اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور چلنے ہی کو تھا کہ شہزادی کو ہوش آگیا۔ اس نے غل مچایا بادشاہ کی بھی آنکھ کھُل گئی اٹھتے ہی جھپٹا کہ شہزادی کو چھین لے۔ توتا الگ پر مارنے لگا۔ اتنے میں شہزادے کے ہم راہی آ گئے۔ اب کیا تھا بادشاہ بچارا اکیلا مصیبت کا مارا کیا کر سکتا تھا۔ شہزادہ شہزادی کو لے چمپت۔ سپاہیوں نے پیچھا چھڑانے کے لیے بادشاہ کی مشکیں باندھ کر غریب کی آنکھیں بھی نکال لیں اور گھوڑا بھی لے گئے۔

کسی نہ کسی طرح تڑپ تڑپ کر بادشاہ نے ہاتھ پاؤں تو کھول لیے لیکن آنکھوں سے اندھا۔ اپنی بے کسی پر آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا۔ توتا لاکھ پرستان کا ہزار داستان سہی۔ تھا تو آخر جانور۔ انسان کی سی خدمت کیونکر کر سکتا پھر بھی اس نے بادشاہ کی بہت تسلی تشفی کی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آپ صبر سے کام لیں میں سب سے پہلے آپ کی آنکھوں کے لیے بوٹی تلاش کرتا ہوں

اور اس کے بعد شہزادی کو ڈھونڈوں گا خدا نے چاہا تو انجام بخیر ہے۔ اب توتا دونوں وقت طرح طرح کے پھل کھانے کو لاتا اور بوٹی کا عرق آنکھوں میں لگاتا خدا کی شان چھے سات ہی دن میں ڈھیلے بننے شروع ہو گئے۔ اِدھر تو بادشاہ ایک درخت کے نیچے فقیروں کی طرح تقدیر کے پھرنے کا منتظر ہے۔ اُدھر سنیے کہ شہزادہ شہزادی کو لیے ہوئے اپنے محل میں پہنچا اور اسے شادی پر رضا مند کرنا چاہا۔ شہزادی اوّل اوّل تو انکار کرتی رہی جب دیکھا کہ شہزادہ اپنے وقت کا حاکم۔ ضد کا پورا ہے تو کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں خوشی سے آپ کے ساتھ شادی کروں تو چھے مہینے مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ اور میرا گھوڑا بھی میرے حوالے کیجیے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا۔

شہزادی گھوڑے سمیت الگ ایک مکان میں رہنے لگی۔ شہزادے کا جب جی چاہتا دوسرے تیسرے دن آ کر مل جاتا۔ اس نے اپنے دل بہلاوے کا یہ سامان نکالا کہ صبح شام پرندوں کو دانہ ڈالا کرتی۔ طرح طرح کے جانور آتے۔ اپنی اپنی بولیاں بولتے۔ اس کا وقت گزر جاتا۔ خیال تھا کہ بے زبان کھائیں گے ان کی آتما خوش ہوگی۔ شاید ان کی دعا سے خدا مجھ کو اس سے رہائی دے۔

کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ بادشاہ کی آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ گھوڑے کی گھاس میں کوئی ایسی پتی آ گئی تھی کہ اس کے پروں میں اڑنے کی طاقت آ گئی۔ توتا بھی بادشاہ کی نگرانی سے بےفکر ہو کر دُور دُور کے دھاوے مارنے لگا۔ ایک دن ہیرامن نے دیکھا پرندوں کے جھلڑ باغ کی ایک عمارت میں چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی سات سمندر پار والی شہزادی دانہ چگا رہی ہے۔ توتا اس کے ہاتھ پر بیٹھ کر بولنے لگا۔

شہزادی چونکی مگر جانور سے کیا ڈرتی توتے کو آدمی کی طرح بولتا دیکھ کر
حیران ضرور ہوئی۔ توتے نے بادشاہ کی پوری کہانی سنائی کہ کس طرح
تمہاری تلاش میں گھر سے نکلا۔ تمہارے لیے سلطنت پر لات ماری
آنکھیں نکلوائیں۔ تکلیفیں اٹھائیں اور یہ باتیں کچھ اس طرح بیان کیں
کہ شہزادی بے چین ہو گئی اور کہنے لگی کچھ بھی ہو اسی وقت مجھے اس
کے پاس لے چلو۔ توتا بولا جلدی کرنا شیطان کا کام ہے۔ دن دہاڑے
تمہارا چلنا عقل مندی نہیں۔ سو دشمن سو دوست۔ کسی نے شہزادے
کو خبر کر دی تو بادشاہ کی مفت میں جان جائے گی۔ اور تمہارے ساتھ
نہ جانے وہ کیا سلوک کرے۔ مناسب یہ ہے کہ رات کو میں آؤں گا
گھوڑا اپنے پاس بندھوا لینا اور تیار رہنا آگے خدا مالک ہے۔ یہ
کہہ کر توتا خوش خوش بادشاہ کے پاس آیا اور کہا آپ نے تو اپنے
اوپر آفت لانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی لیکن خدا نے رحم کیا۔ شہزادی کا
پتا لگ گیا ہے۔ رات کو چلیے اور شہزادی کو لے کر اپنے گھر سدھاریئے بلکہ
وہاں پہنچتے ہی بیاہ رچایئے۔ پہلے تو وہ آپ سے شادی کرنے پر راضی
ہوتی یا نہ ہوتی اب اس کے دل میں آپ کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔
اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ بادشاہ خوشی کے مارے اُچھل پڑا۔
وقت گزارنا دُوبھر ہو گیا۔ غرضیکہ رات ہوئی ہیرامن چلا شہزادی ہر
طرح سے لیس گھوڑے کی لگام پکڑے منتظر تھی۔ توتا گھوڑے کی
گردن پر بیٹھ کر بولا۔ "بسم اللہ رکاب میں پیر رکھیے" شہزادی کا سوار ہونا
تھا کہ توتے نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ چلا اور ایک دم بھر میں
درخت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ بھی تیار تھا۔ جھٹ پیٹھ پر چابک

بچھایا ایک ہی اڑان میں بادشاہ اپنے محل میں تھے۔ خوشی کے نقّارے بجنے لگے۔ دوست شاد دشمن پامال ہوئے بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ خدا نے دن پھیر دیے۔ ہیرامن کی وفاداری دیکھیے کہ مارے محل میں بادشاہ کے بچوں سے باتیں کرتا ان کا جی بہلاتا۔ کھلے بندوں۔ اہلا گہلا پھرا کرتا اور پرستان جانے کا نام بھی نہ لیتا۔ بے وفا اور توتا چشم انسانوں سے تو ایسا جانور ہزار درجہ اچھا۔

مغرور تیندوا

س زمانے میں جب کہ جنگلوں میں صرف درندوں ہی درندوں کی حکومتیں تھیں انسانوں کی بستیاں بہت دور دور تھیں۔ ایک ہرے بھرے میدان میں کوئی تیندوے کا بچہ رہتا تھا۔ ماں باپ اسے گُلدار کہتے تھے۔ ماں باپ کو اپنے سب ہی بچے پیارے ہوتے ہیں۔ اکلوتی اولاد تھی وہ اسے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھے جنگل میں تیندوؤں کے اور خاندان بھی اپنے بچوں کو اسی نگاہ سے دیکھتے اور اپنی اولاد پر ناز کرتے لیکن آدمی کے بچے ہوں یا جانور کے ماں باپ کا حد سے زیادہ لاڈ پیار انھیں خراب کر دیتا ہے۔ بڑے ہوتے ہوتے ان میں غرور اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی بہت سی بُری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر جانور۔ تو جانور آدمی تک کو ان کی یہ باتیں بُری لگتی ہیں۔ اور وہ جل کر ان سے کہتے ہیں کہ تم اپنی حرکت سے باز نہیں آتے تو ہماری طرف سے جاؤ چولھے میں۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے انسان کو تھوڑا بہت افسوس ہوتا ہے وہ بھی دوسروں کی ملامت کا۔ جانور اس سے آزاد ہیں۔ ان کے بچے جہاں

بڑے ہوئے اور وہ انھیں بھول گئے۔ بالکل اجنبیوں کی طرح وہ الگ یہ الگ۔ ان کا رہنا سہنا کھانا پینا مرنا جینا جُدا اُن کا جُدا۔ کوئی انھیں پھاڑ کھائے تو انھیں پروا نہیں۔ کسی کو یہ پھاڑ ڈالیں تو چیاں نہیں۔

لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ماں باپ گلدار کے بچپن کی حرکتوں سے خوش تھے یا نہ تھے۔ اس پر خود ایسی اکڑ سوار تھی کہ اپنے سوا کسی کو دیکھ ہی نہ سکتا اور گھمنڈ بھی بالکل نرالا۔ دیکھا نہ سُنا یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کتے ہیں اور بچے نہیں ہوتے اور اس بیے سارا خاندان اسی اکیلے سے محبت کرتا ہے۔ اتفاق سے جنگل میں کسی کے بچے نہ تھے۔ گلدار ہی گلدار سب کو دکھائی دیتا۔ جہاں جاتا اس کی خاطر مدارت ہوتی۔ جو دیکھتا خوش ہوتا اور بُری سے بُری حرکت پر بھی کوئی اسے نہ ٹوکتا۔ اصل میں یہی چیز اس کے مغرور ہونے کا بڑا سبب تھی۔

اچھا اسے غرور کس بات کا تھا؟ اپنے جسم کی چتیوں کا! سب تیندوے چتی دار ہوتے ہیں۔ قدرت نے ان کو چتی دار لباس دیا ہے۔ اس میں انوکھی کون سی بات ہوئی؟ آپ نے انسانوں کو نہیں دیکھا۔ ان کے دماغ میں بھی ایسی ہی فضول ہوائیں بھر جاتی ہیں۔ کوئی اپنے دانتوں پر ناز کرنے لگتا ہے تو کوئی اپنے آنکھوں پر کسی کو اپنی ناک اچھی معلوم ہوتی ہے تو کسی کو اپنے بال۔ گلدار کو اپنے بدن کی چتیوں کی گنتی پر فخر تھا۔ تیندوؤں کی چتیاں کون گننے جاتا ہے۔ خدا جانے کتنی ہوتی ہیں۔ مگر پاگل پن جو ٹھہرا۔ گلدار نے ان کی گنتی کر لی تھی۔ اور ایک دفعہ نہیں کئی مرتبہ۔ اس کے جسم پر سات سو پچیس چتیاں تھیں۔

پہلے پہل جب اُسے خیال آیا ہے تو صبح کو انگڑائی لیتے لیتے گنا۔

پھر رات کو سوتے وقت دوبارہ گنیں کہ دن بھر میں کوئی غائب تو نہیں ہو گئی۔ اسی طرح وہ اکثر صبح شام گنا کرتا۔ ایک بار جو اس نے گنتی کی تو سات سو چوبیس نکلیں۔ ایک چتی کیوں کم ہو گئی؟ سارے دن وہ بہت پریشان اور رنجیدہ رہا۔ اس روز کہیں اس کا جی نہیں لگا۔ رات کو گھر آیا اور بیٹھ کر دوبارہ گننے لگا۔ اب جو گنتا ہے تو پوری سات سو پچیس ایک چھوٹی سی بُند کی دم کی جڑ میں گنتی سے رہ گئی تھی۔ تیندوا خوش ہو گیا۔

تم دل میں سوچتے ہو گے کہ بدن اور ٹانگوں وغیرہ کی چتیاں گننے میں کوئی مشکل نہیں لیکن چہرے اور گردن کی بُندکیاں اس نے کیوں کر گنی ہوں گی۔ وہاں تک تو نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ بھلا بتاؤ آدمی اپنی ناک آنکھ کان گردن کس طرح دیکھتا ہے؟ تم کہو گے کہ آئینے میں! جانوروں کے پاس آئینہ کہاں؟ جانوروں کا آئینہ پانی ہے اور جب تک انسان نے آئینے کی ایجاد نہیں کی تھی وہ بھی پانی سے آئینے کا کام لیا کرتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ گلدار نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ تالاب کے کنارے جا کھڑا ہوتا اور اپنا سایہ پانی میں دیکھ کر چہرے اور گردن کی چتیاں گن لیتا۔

ایک روز پڑوس کی شیرنی موتی گلدار کی ماں سے ملنے آئی دونوں میں بڑی محبت تھی۔ گلدار نے منہ سے تو کچھ کہا نہیں بلکہ معمول کے مطابق نہ کہیں کھیلنے کو گیا نہ کودنے کو بلکہ جب تک وہ بیٹھی باتیں کرتی رہی یہ برابر ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھا کیا۔ ایک منٹ کو اس پر سے آنکھ نہ اٹھائی۔ پہلے اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھا رہا پھر اس کی

پیٹھ کے پیچھے جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں پیچھے سے اٹھ کر پہلو میں آ گیا بعد ازاں اِس پہلو سے اُس پہلو میں۔ مختصر یہ کہ لٹو کی طرح اس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ موتی شیرنی کو تیندوے کے بچّے کی یہ حرکتیں بہت بُری معلوم ہوئیں دل میں کہا، بڑا شریر ہے۔ بڑوں کا بھی لحاظ نہیں۔ لیکن بڑوں کی بڑی باتیں اپنی شرافت سے غصّہ پی کر رہ گئی۔ جھڑکنا گھُڑکنا کیسا تیندوی سے شکایت تک نہ کی اس کے رخصت ہونے کے بعد گلدار کی ماں بولی

تیندوی : گلدار! تم نے دیکھا۔ کیسی خوبصورت بیگم ہے۔ تمھارے ابّا پر جس طرح ان کے ابّا مہربان اسی طرح انھیں مجھ سے محبّت ہے۔ جب جی چاہتا ہے بے تکلف آجاتی ہیں۔ اور تو نے ان کے کپڑے دیکھے۔ کس قدر اچھی پوشاک پہنے ہوئے تھیں؟

گلدار : (ناک چڑھا کر) پانسو بیالیس ۵۴۲۔

تیندوی حیران ہو کر بیٹے کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ کیا سمجھتی کہ پانسو بیالیس ۵۴۲ سے اس کا کیا مطلب ہے۔

تیندوی : پانسو بیالیس کیا؟

گلدار : (آنکھیں مٹکا کر حقارت کے ساتھ) دھاریاں اور کیا۔ میں نے گن لی ہیں۔

تیندوی : (ہنس کر) خدا کی سنوار! ارے تو اِدھر اُدھر پھر کر یہی گن رہا تھا۔

گلدار : اور کیا!

تیندوی : تجھے ڈر بھی نہیں لگا۔ جو وہ ناراض ہو جاتیں؟

گلدار : میری بلا سے۔ میں کیوں ڈروں۔ ان میں کون سا سرخاب کا پَر

لگا ہوا ہے۔

گلداری یہ حرکتیں ایک ہی دن نہیں روز ہوتیں۔ ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے اور ماں باپ ہنس کر ٹال دیتے۔ بچپن کی شوخیاں سمجھتے۔ وہ جب اپنی چتّیاں گنتا۔ ساتھ ہی دوسرے جانوروں کے گل بُوٹوں اور دھاریوں کا بھی شمار کرتا رہتا۔ تیندوؤں، شیروں کے سوا اس کی نظر سے دوسرے جانور بھی نہیں بچے تھے۔ شیہ کے کانٹے بھی اس نے گن لیے چار سو اڑتیس گنتی میں آئے۔ چھوٹے مگرمچھ کے کھپروں کا شمار بھی وہ کر چکا تھا۔ تین سو ستر ۳۷۰ سے زیادہ نہ تھے۔ زراف کے بوٹے بھی اس نے بارہا گنے تھے۔ اتنا بڑا جانور۔ اونٹ سے زیادہ لمبا اور پوشاک ایسی سادی۔ پیوند سے لگے ہوئے جیسے دھبّے پڑ جائیں۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوں۔ اُن کے گننے کی بھی اس نے کبھی تکلیف نہیں اٹھائی۔ سرسری نگاہ سے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔

وہ اپنے دل میں کہا کرتا کہ جنگل میں میری برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ کم سے کم دو سو بندکیوں سے میں زیادہ ہوں۔ اگر کوئی یقین نہ کرے تو آجائے مقابلے میں۔ جس کو دعوا ہو گن لے۔ اللہ نے مجھ کو گلدار بنایا ہے۔ اتنی بُوٹیاں کسی میں ہوں تو میں ہارا۔ میرے بدن پر یہ بندکیاں خدا نے اپنے ہاتھ سے لگائی ہیں۔ قدرت کو میری شان بڑھانی منظور تھی۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہیں آتا اپنے کو سب سے اونچا سمجھتا ہے۔ گلدار کا یہ غرور بہت جلد ٹوٹ گیا۔ سیر کو سوا سیر، زبر کو زیر سنا ہوگا۔ جنگل کے دوسرے سرے پر ایک چیتا رہتا تھا۔ اتفاق کی بات ان کے ہاں بھی بچوں کی برکت تھی۔ سارے خاندان میں صرف

ایک بچہ بڑا خوبصورت. جنگل کے سب جانور اسے پھُن بھرا پھُل بھرا کہتے تھے۔ عمر تو اس کی زیادہ نہیں تھی۔ بہت سے بہت چھے مہینے کا ہو گا۔ مگر اُٹھان کا اچھا تھا۔ ہاتھ پیروں میں اپنے ماں باپ کے برابر معلوم ہوتا۔ بہت ہلکا چمپئی رنگ اور ناک سے لے کر دُم تک نہایت خوشنما چمکیلی سیاہ بوٹیوں کا جال سا پڑا ہوا دیکھنے والوں کو یہ نظر آتا کہ پھولوں سے لدی ہوئی کیاری ہے۔ یا ہلکی زرد چادر پر کسی نے کالی پوتھ کے دانے بکھیر دیے ہیں۔

جس روز اللہ میاں نے گلدار کا گھمنڈی دماغ درست کرنا چاہا ہے پھُل بھرے اور اس کا سامنا ہوا۔ پہلے تو ایک نے دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا پھر خاموش بغیر غرفش کیے ٹہلنا شروع کیا گلدار پھُل بھرے کے گرد پھرتا اور پھُل بھرا گلدار کے گرد چکر کاٹتا بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے صدقے ہوتے رہے۔ اصل میں دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کی بُندکیاں چتیاں پھول پتے گن رہے تھے۔ خدا خدا کر کے دونوں کی گنتی ختم ہوئی۔

تم سمجھتے ہو کہ اس چپقلش اور گنتی کرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ دونوں کی ٹھیک برابر کی بوٹیاں تھیں۔ اِدھر بھی سات سو پچیس ۷۲۵ اُدھر بھی سات سو پچیس ۷۲۵۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ پھُل بھرا تو ایسا چھچھورا تھا نہیں کہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ گلدار کے غرور کو ٹھیس لگی تھی۔ اس کی غصے کے مارے بری حالت تھی۔ مقابلے میں جیتنے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نجانے کیا کر بیٹھتا۔ تاہم اس سے نہ رہا گیا۔ پھُل بھرا جانے کو ہوا تو گلدار چلا کر بولا۔ "جاتے کہاں ہو ایک دفعہ مجھے اور گننے دو۔"

پھُل بھرا۔ بھائی ایک دفعہ نہیں دس دفعہ گن لو۔ میں کھڑا ہوں، جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر لو۔

گلدار: جب تک میری تسلّی نہیں ہو جائے گی تم جانے نہیں پاؤگے۔

پھُل بھرا: (مسکراکر) تم اچھی طرح اپنی تسلّی کر لو۔ کہو تو رات تک یہیں بیٹھا رہوں۔ اور کیا کہوں اگر مجھے خبر ہوتی کہ تمھارے دل میں یہ بات ہے تو میں اِدھر آتا بھی نہیں اور آتا تو دو چار بوٹیاں مٹا کر آتا۔

یہ سُن کر گلدار اور بھی جل گیا۔ اور اس نے بڑی احتیاط سے گنتی شروع کی۔ ایک بار دو بار تین بار چار بار۔ اللہ ہی جانے کتنی دفعہ اس نے گنتی کی مگر غصّے کی وجہ سے کم ہونے کے بدلے دو چار بڑھ جاتیں۔ ایک مرتبہ بھی سات سو چوبیس نہ نکلیں۔ آخر وہ جھلّا گیا اور اتنے میں اندھیرا ہو چلا تھا۔ چاندنی رات بھی نہ تھی اس لیے مجبوراً پھُل بھرے کا پیچھا چھوڑ اپنے گھر چلا آیا۔

چہرہ اُداس تھا۔ نہ شوخیاں تھیں نہ اُچھل کود۔ اب وہ آٹھ پہر غمگین رہنے لگا۔ اس کے دل میں اتنی تاب کہاں تھی کہ جنگل کا کوئی گلداری اور چتکبرے پن میں اس سے بڑھ جاتا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آنے لگا کہ آج کو چیتے کا بچّہ بازی لے گیا تو کل اور کوئی نکل آئے گا۔ اس کی شیخی یونہی کرکری ہوتی رہے گی۔

اپنے غم کی یہ داستان گلدار نے اپنی ماں سے کہی نہ باپ کو سُنائی۔ لیکن وہ اس کی بے چینی دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ جو معمول کے موافق نہ یہ بولتا ہے نہ چالتا۔ چُپ لگ گئی ہے۔ انھوں نے بہتیرا پوچھا کہ بیٹا کیا بات ہوئی چُپ چُپ کیوں رہتے ہو مگر اس نے کوئی بات

نہ بتائی۔

نئی بات یہ تھی کہ گلدار نے اپنی صورت کے متعلق شیخیاں مارنی بھی چھوڑ دی تھیں۔ گھر سے باہر بھی بہت کم نکلتا۔ ہر وقت بیٹھا ہوا اپنے بدن کی بوٹیاں یا بُندکیاں گِنا کرتا۔ رات ہو یا دن جب دیکھو اس کا یہی شغل ہے۔ صبح شام خدا سے دعائیں مانگا کرتا کہ ایک ہی بُندکی اور دے دے، سات سو پچیس کی جگہ سات سو چھبیس ہو جائیں۔ لیکن اللہ میاں بھی اس کی دعا قبول نہیں کرتے تھے۔

راتوں کی نیند جاتی رہی تھی۔ پڑے پڑے بیسیوں ترکیبیں سوچتا کہ کسی طرح ایک چتّی اور بڑھ جائے لیکن نہ دعا کارگر ہوتی تھی نہ تدبیر۔ جب صبح کو گِنتا یا رات کو دیکھتا وہی سات سو پچیس ایک بُندکی تک نئی نہ دکھائی دیتی۔

اپنے جنگل میں اسے کھیلتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ گھر میں پڑے پڑے بہت جی اُکتا جاتا تو اندھیرے اُجالے دور اِدھر اُدھر چھپتا چھپاتا نکل جاتا۔ ایک روز جو نکلا اور ٹہلتے ٹہلتے دوسرے جنگل میں پہنچا تو دیکھا کہ شیرنی درخت کی چھال سے رگڑ رگڑ کر اپنے دانت تیز کر رہی ہے۔ اس کی نظر گلدار پر پڑی دل میں مسکرائی اور گلدار کی طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ کہنے لگی ؎

چتّی پہ چتّی رکھ کے یار
گِن لو چاہے جتنی بار

پھول بھرے سے سب ہیں مات
اُس کے ساتھ ہے اُس کی بات

گلدار کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر کچھ جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ بات ٹال کر جیسے کچھ سنا ہی نہیں نکلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پچاس چالیس قدم چلا ہوگا۔ کہ زراف کے سامنے سے گزرا۔ وہ کھڑا ہوا اونچے سے اونچے درختوں کی پھننگوں پر منہ مار رہا تھا۔ گلدار کو دیکھ کر اس نے اپنا منہ اور اونچا کر لیا اور اس طرح اپنے کھانے کے شغل میں مصروف رہا جیسے کچھ خبر نہیں کون جا رہا ہے۔ اور کون آ رہا ہے۔ گلدار جب اس کے برابر سے نکلا تو اس نے زراف کو چبا چبا کر کہتے سنا ۔

پھول بھرا اور گلدار آج
دونوں کے سر پر روپ کا تاج
اپنا اپنا ہے بھناؔ
پھول بھرے کا کیا ہی کہنا

اس آواز نے گلدار کے دماغ پر چوٹ لگائی۔ کھسیانا ہو کر ہونٹ چبانے لگا۔ سب ہی اسے چھیڑ رہے تھے۔ وہ سمجھا کہ پھول بھرے بدمعاش کا یہ کام ہے۔ اس نے شیخیاں ماری ہیں۔ یہ خیال کر کے گلدار اور زیادہ اپنے دل کے اندر پیچ و تاب کھاتا۔ سب سے زیادہ جو اسے جلن تھی وہ اس بات کی کہ یہ واقعہ سچا تھا۔ اس لیے اس کان سن کر اس کان اڑانے کے سوا کیا کرتا چنانچہ لاپروائی کے ساتھ وہ یہاں سے بھی گزر گیا گویا کچھ خبر ہی نہیں کہ کون ہے اور کس نے کیا کہا۔

چلتے پھرتے اب وہ ناریل کے ایک بہت اونچے درخت کے پاس

لہ نصیب۔

پہنچا۔ درخت کی چوٹی پر لنگور صاحب بیٹھے تھے۔ اس لنگور کو جنگل کے سارے چھوٹے بڑے پرندوں درندوں سے پیدائشی دشمنی تھی۔ خاص کر جھگبرے جانوروں سے تو اسے بالکل ہی نفرت تھی۔ جہاں اس نے چتی دار کسی جانور کو دیکھا اور ناک چڑھائی کیا مجال کہ بے چوٹ کیے رہ جائے۔

اس نے تیندوے کے بچے گلدار کو جو آتے دیکھا تو پہلے منہ بنانا شروع کیا۔ پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ کسی طرح اسے ستا کر اپنا دل ٹھنڈا کرے، آخر سوچتے سوچتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ایک بڑا سا ناریل توڑ کر اس کا نشانہ بنائے اور جب گلدار اس کی زد میں آئے تو وہ ناریل اس کے اوپر دے مارے چنانچہ گلدار کا زد میں آنا تھا کہ لنگور نے اس طرح ناریل پھینکا کہ ٹھیک گلدار کے سر پر آیا۔ گلدار نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر منہ اوپر اٹھایا ہی تھا کہ ناریل کھٹ سے اس کے دونوں آنکھوں کے بیچ میں پڑا۔

لنگور تو پتوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ تو دکھائی دیا نہیں۔ نہ گلدار نے یہ جانچا کہ ناریل کدھر سے آیا۔

وہ تو اس خیال میں پڑ گیا کہ کسی نے اسے ذلیل کرنے کے لیے یہ وار کیا ہے اور آج سارے دن اس کی ہر طرف بے عزتی ہی بے عزتی ہوتی رہی ہے۔ جھونجل تو بہت آئی۔ مگر جھونجل اتارے تو کس پر۔ غیبی گولا پڑا تھا غصہ پی کر چپ چاپ اپنے گھر کی طرف پلٹا کہ کہیں اور آگے گیا تو کوئی اور مذاق اڑانے والا نہ مل جائے۔

چوٹ کھا کر گھر آیا۔ پہلے سے زیادہ پریشان۔ ویسے ہی دل ٹھکانے

نہ تھا۔ اس پر چوٹ لگی۔ تمام رات سر کی تکلیف سے بے چین رہا۔ بھیجے میں سخت درد تھا۔ ہائے ہائے کرتے صبح ہو گئی۔ دُکھ میں ذرا کمی نہ تھی۔ جی میں آیا کہ تالاب پر چل کر زخم کو دھونا چاہیے۔ شاید جلن میں کچھ کمی ہو۔

تالاب پر جا کر کیا ہوا یہ تماشا سنو۔ زخم کی تکلیف میں کمی ہوئی یا نہ ہوئی پانی میں اپنی شکل دیکھتے ہی دل کی آگ بُجھ گئی، ماتھے کے ٹھیک بیچ میں ناک کی جڑ کے پاس جس جگہ ناریل سے چوٹ لگی تھی ایک گول چونی کے برابر نیل پڑا ہوا تھا۔ جسم کی ساری بُندکیوں اور چتیوں سے زیادہ سیاہ۔

یہ نئی چیتی دیکھ کر گلدار خوشی سے اُچھل پڑا۔ کیسی تکلیف کیسا درد سب بھول گیا۔ اب وہاں ٹھہرنے کا کیا کام تھا۔ اُچھلتا ہوا بے تحاشا بھاگا۔ اور ایک سانس میں سیدھا پھُل بھرے کے گھر پہنچا۔

پھُل بھرا اپنے بھٹ کے آگے ایک پتھر پر بیٹھا دھوپ میں سنک رہا تھا۔ گلدار نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے دیکھا۔ مسکرایا اور کہنے لگا سات جھبیس ۲۶۔

خرگوش کا سپنا
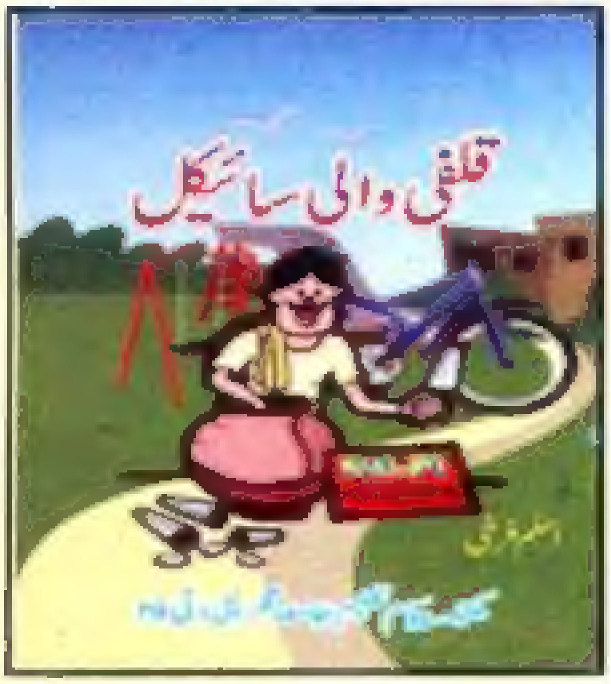
قلفی والی سائیکل

تابعدار
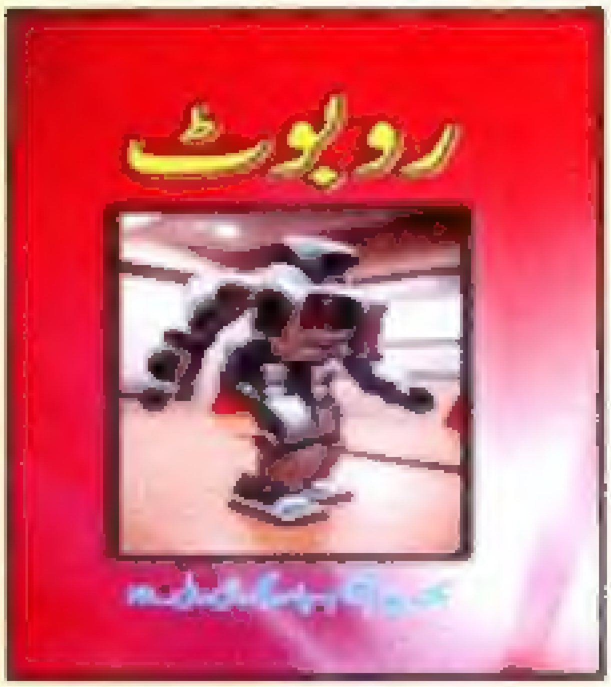
روبوٹ
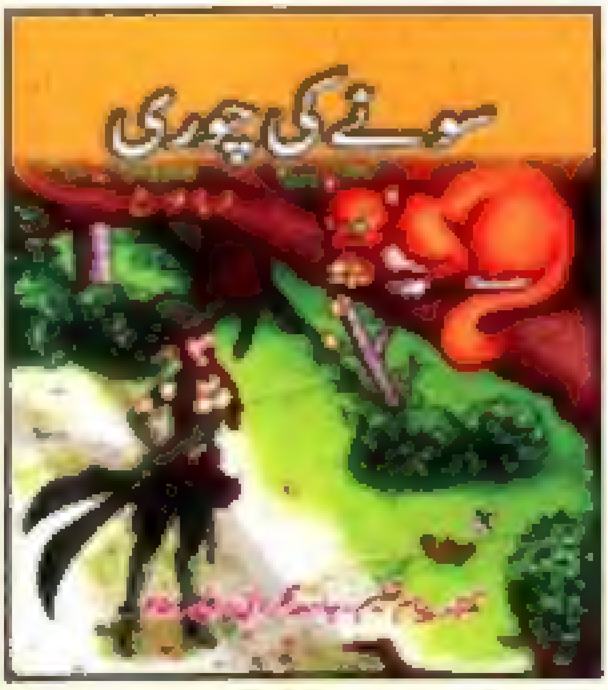
سونے کی چوری

شہزادی گلنار